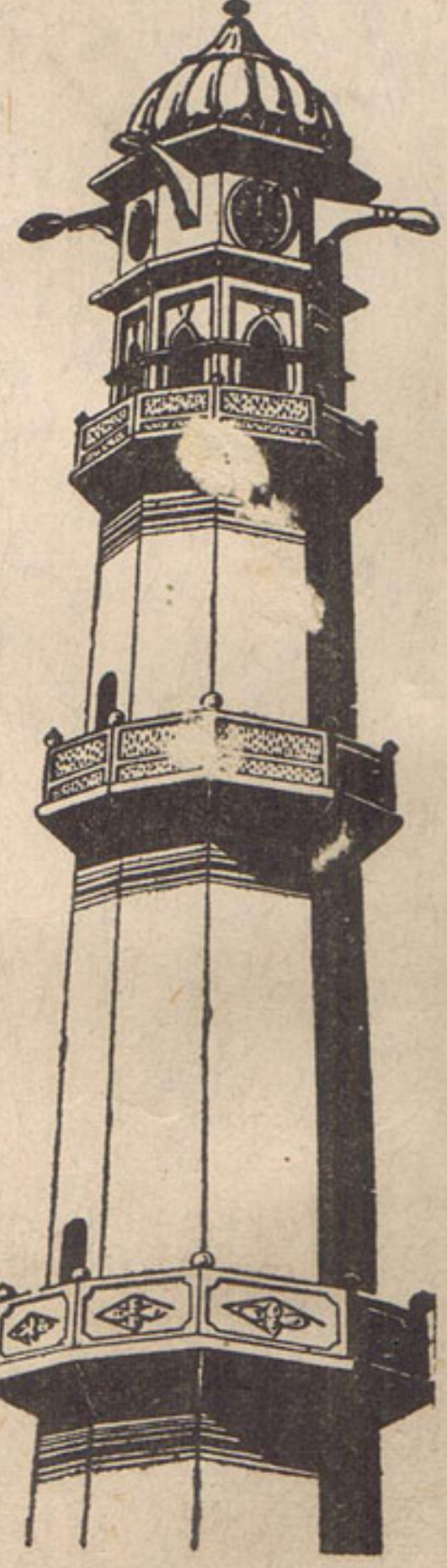

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

جولائی ، اگست ، ستمبر ۱۹۶۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روشنی اور رفعت کا نشان

سالنامہ ۱۹۶۴ء

المنار

تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ

نگران اعلیٰ
شیخ محبوب عالم خالد۔ ایم اے

مدیر اعلیٰ
عطاء المجیب راشد

مدیران
سید شمشاد علی
مبارک احمد عابد ربانی

جلد ۱۴ ——— جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۶۴ء ——— شمارہ ۱

(جنید ہاشمی پرنٹر و پبلشر نے ضیاء الاسلام پریس ربوہ میں چھپوا کر تعلیم الاسلام کالج ربوہ سے شائع کیا)

عکس

- اداریہ — مدیر اعلیٰ
- سالانہ روداد — صاحبزادہ مرزا ناصر احمد ایم۔ اے آکسن (پرنسپل)
- خطبۂ جلیلہ — حضرت حافظ مختار احمد شاہجہانپوری
- اُردو شاعری کا زرّیں دور — لطف الرحمٰن محمود
- سات قصیدے جو خانہ کعبہ کے پردوں سے لٹکائے گئے — عطاء المجیب راشد
- ہمارا قومی ادارہ ـــــ تعلیم الاسلام کالج — داؤد طاہر
- علم و عمل — اقبال احمد انجم
- منگلا ڈیم ـــ ایک عظیم منصوبہ — محمود احمد
- تقلید اور فطرتِ انسانی — ہدایت اللہ ہادی
- ان سے ملیئے ! (مزاح) — زرتشت منیر احمد
- لا تثریب علیکم الیوم — منور احمد قاسم
- یاد — محمد اسلم شاد
- خوش خلقی انسانیت کا زیور ہے — بشارت نذیر
- چشمِ بددُور (مزاح) — لطف الرحمٰن محمود
- آنکھوں کی حفاظت — ماخوذ
- پگڈنڈیاں — محمود احمد ولیس، انعام اللہ ہاشمی، عبدالشکور اظہر، نثار احمد بسرا۔
- تمباکو نوشی کس طرح ترک کریں ؟ — .. .. ..
- کالی پینٹ، سفید قمیص، سفید ساڑھی کا لا بلاؤز (افسانہ) — سعید انجم
- آہ یہ دنیا ! (افسانہ) — صداقت علی
- آخری لاش (افسانہ) — وہاب اشرفی
- شبستانِ غزل — شریکِ محفل :۔ ثاقب زیروی، عبدالسلام اختر، نظر امروہی، ارشد ترمذی، عابد ربانی اور دوسرے ـــــ

قال اللہ تعالیٰ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

کھانے پینے کے آداب

کھانے پینے کے بارہ میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جن اصولی ہدایات کا ذکر فرمایا ہے اُن کا خلاصہ یہ ہے :-

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا - وَاتَّقُوا اللّٰهَ (مائدہ : ۸۹)

فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ (انعام : ۱۱۹)

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا - إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (اعراف : ۳۲)

اِن سب آیات میں اور اِسی طرح کی اور متعدد آیات میں خالق کائنات نے انسانوں کو رزقِ حلال استعمال کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ ان خدائی نعمتوں کا استعمال بھی حد سے زیادہ یا نامناسب طریق پر نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یہ امر خدا تعالیٰ کو ناپسند ہے۔

سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم نے دیگر احکامات کے ساتھ کھانے پینے کے بارہ میں بھی تفصیلی ارشادات فرمائے ہیں۔ دو احادیث ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ حضرت عمر بن ابی سلمہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

سَمِّ اللّٰهَ وَكُلْ بِيَمِيْنِكَ وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ (متفق علیہ)

ترجمہ :- (تو کھانا شروع کرنے سے قبل) اللہ تعالیٰ کا نام لیا کر۔ دائیں ہاتھ سے کھایا کر اور برتن میں اُس حصّہ سے کھانا کھا جو تیرے قریب ہو۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت بیان فرماتے ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

لَا يَشْرَبَنَّ اَحَدٌ مِّنْكُمْ قَائِمًا - فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِئْ -

ترجمہ :- تم میں سے کوئی شخص کبھی کھڑے ہونے کی حالت میں کوئی چیز نہ پیئے پس جو بھول جائے تو وہ زبردستی اُسے قے کر دے۔

اِن احادیث سے چار باتوں کا علم ہوتا ہے۔ اوّل کھانے پینے کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے کرنی چاہیئے ایک دوسری حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص شروع میں بسم اللہ پڑھنی بھول جائے تو جب اُسے یاد آئے تو وہ بِسْمِ اللّٰهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ پڑھ لیا کرے۔ دوم دائیں ہاتھ سے کھانا اور پینا۔ دیکھا گیا ہے کہ نئی تہذیب کے بداثرات کے نتیجہ میں اکثر لوگ بلاوجہ پانی وغیرہ بائیں ہاتھ سے پیتے ہیں۔ اِس بُری اور قبیح عادت کا ازالہ ہونا چاہیئے۔ سوم اپنے سامنے سے کھانا۔ اِس سے سلیقہ اور صفائی کے علاوہ کئی اور فوائد بھی ہوتے ہیں۔ چہارم بیٹھ کر پینا۔ طبّی نقطہ نگاہ سے اِس ارشاد کی تعمیل میں کئی فوائد مضمر ہیں ——— یہ امور بظاہر چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن اِن پر عمل کرنا بہت بڑے فوائد اور برکات کا موجب ہے۔

تبرکات

ہماری پیاری کتاب

(کلمات طیبات سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام)

"اور تمہارے لیئے ایک ضروری تعلیم یہ ہے کہ قرآن شریف کو مہجور کی طرح نہ چھوڑ دو کہ تمہاری اسی میں زندگی ہے۔ جو لوگ قرآن کو عزت دیں گے وہ آسمان پر عزت پائیں گے۔ جو لوگ ہر ایک حدیث اور ہر ایک قول پر قرآن کو مقدم رکھیں گے اُن کو آسمان پر مقدم رکھا جائے گا۔ نوعِ انسان کے لیئے رُوئے زمین پر اب کوئی کتاب نہیں مگر قرآن۔"

"میرا مذہب یہ ہے کہ تین چیزیں ہیں کہ جو تمہاری ہدایت کے لیئے خدا نے تمہیں دی ہیں۔ سب سے اوّل قرآن ہے جس میں خدا کی توحید اور جلال اور عظمت کا ذکر ہے اور جس میں ان اختلافات کا فیصلہ کیا گیا ہے جو یہود اور نصاریٰ میں تھے۔ اسی طرح قرآن میں منع کیا گیا ہے کہ بجز خدا کے تم کسی چیز کی عبادت نہ کرو۔ نہ انسان کی نہ حیوان کی نہ سورج کی نہ چاند کی اور نہ کسی اور ستارہ کی اور نہ اسباب کی اور نہ اپنے نفس کی۔ سو تم ہوشیار رہو اور خدا کی تعلیم اور قرآن کی ہدایت کے برخلاف ایک قدم بھی نہ اٹھاؤ۔ مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ جو شخص قرآن کے سات سو حکم میں سے ایک چھوٹے سے حکم کو بھی ٹالتا ہے وہ نجات کا دروازہ اپنے ہاتھ سے اپنے پر بند کرتا ہے۔ حقیقی اور کامل نجات کی راہیں قرآن نے کھولیں اور باقی سب اس کے ظلّ تھے۔ سو تم قرآن کو تدبّر سے پڑھو اور اس سے بہت ہی پیار کرو، ایسا پیار کہ تم نے کسی سے نہ کیا ہو۔ کیونکہ جیسا کہ خدا نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اَلْخَیْرُ کُلُّہٗ فِی الْقُرْاٰنِ کہ تمام قسم کی بھلائیاں قرآن میں ہیں۔ یہی بات سچ ہے۔ افسوس اُن لوگوں پر جو کسی اور چیز کو اس پر مقدم رکھتے ہیں۔ تمہاری تمام فلاح اور نجات کا سرچشمہ قرآن میں ہے۔ کوئی بھی تمہاری ایسی دینی ضرورت نہیں جو قرآن میں نہیں پائی جاتی۔ تمہارے ایمان کا مصدق یا مکذب قیامت کے دن قرآن ہے اور بجز قرآن کے آسمان کے نیچے اور کوئی کتاب نہیں جو بلاواسطہ قرآن تمہیں ہدایت دے سکے۔ خدا نے تم پر بہت احسان کیا ہے جو قرآن جیسی کتاب تمہیں عنایت کی۔ مَیں تمہیں سچ سچ کہتا ہوں کہ وہ کتاب جو تم پر پڑھی گئی اگر عیسائیوں پر پڑھی جاتی تو وہ ہلاک نہ ہوتے۔ اور یہ نعمت اور ہدایت جو تمہیں دی گئی اگر بجائے توریت کے یہودیوں کو دی جاتی تو بعض فرقے ان کے قیامت سے منکر نہ ہوتے۔ پس اس نعمت کی قدر کرو جو تمہیں دی گئی۔ یہ نہایت پیاری نعمت ہے، یہ بڑی دولت ہے۔ اگر قرآن نہ آتا تو تمام دنیا ایک گندے مضغہ کی طرح تھی۔ قرآن وہ کتاب ہے جس کے مقابل پر تمام ہدایتیں ہیچ ہیں۔ قرآن ایک ہفتہ میں انسان کو پاک کر سکتا ہے اگر صوری و معنوی اعراض نہ ہو۔ قرآن تم کو نبیوں کی طرح کر سکتا ہے اگر تم خود اس سے نہ بھاگو۔"

(کشتی نوح)

اداریہ

اسلام دینِ فطرت ہے اور اس عظیم صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات ہر سلیم الفطرت اور نیک طینت شخص کے دل کی آواز ہیں۔ اسے ان احکامات پر عمل پیرا ہونے میں ذرہ بھر بھی تامل نہیں ہوتا کیونکہ وہ خود اس بات کا متمنی ہوتا ہے کہ انسانی اعمال کو ایسے سادہ، مؤثر اور مفید احکامات کا سہارا دیا جائے جو اس کی تاریک و تار زندگی کے لئے صبح درخشندہ کی ضمانت بن سکیں۔ انسانی فطرت محنت کے بعد مناسب اجر کی متقاضی ہے اور انسان فطرتاً اس بات کا آرزو مند ہے کہ جب وہ خلوصِ دل کے ساتھ محنت کرتا ہے اور اپنے نفس کا آرام ترک کر کے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کوشاں رہتا ہے تو اُس کی اِس کوشش اور محنت کو سراہتے ہوئے مناسب معاوضہ اور دلجوئی کی صورت پیدا کی جائے اور عزت و احترام کے ذریعہ حوصلہ افزائی کی جائے۔

مذہب اسلام نے علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض کیا ہے۔ حصولِ علم کی خاطر طالب علم کو اپنے نفس، مال اور وقت کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ بسا اوقات اُسے ایک معمولی سی بات معلوم کرنے کی خاطر دن کا آرام اور رات کا سکون قربان کرنا پڑتا ہے، وہ ایک خاص علم میں مہارت اور دسترس حاصل کرنے کے لئے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرتا ہے۔ کسبِ علم کی خاطر مختلف ممالک کے سفروں کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے اور تب جا کر وہ اپنے گوہرِ مقصود کو حاصل کرتا ہے۔ فطرتِ انسانی کے مطابق ضروری تھا کہ طالب علم کی اس محنت کو نوازا جائے۔ چنانچہ مذہب اسلام نے اگر ایک طرف طلبِ علم کو لازمی قرار دیا ہے اور اس امر کا تاکیدی حکم دیا ہے کہ ہر مسلمان مرد و زن اپنے آپکو زیورِ علم سے آراستہ کرے تو دوسری طرف طالب علم کو معاشرۂ اسلامی میں ایک بلند مقام عطا فرمایا ہے۔ قرآن مجید میں اہلِ علم کی فضیلت اور برتری کا تذکرہ ہے، پھر احادیثِ نبویہ میں طالب علم کو مجاہد فی سبیل اللہ کا درجہ دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اس کائناتِ آب و گل کی ہر چیز حقیقی طالب علم کے لئے باری تعالیٰ کے حضور استغفار کرتی ہے اور ملائکہ اُس کے اِس نیک فعل کی وجہ سے اپنی مدد و نصرت کے بازو اُس کے لیے جھکاتے ہیں۔ اسلام میں طالب علم کو یہ بلند مرتبہ صرف اِس وجہ سے دیا گیا ہے کہ جب وہ اس کارِ خیر کو پورے خلوص اور شرح صدر کے ساتھ بجا لاتا ہے تو اُس کی محنت خدائے رحیم و کریم کی بارگاہ میں شرفِ قبولیت پاتی ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل و کرم کی کوئی انتہا نہیں۔ اس کا کمزور بندہ جب ایک حقیر سی نیکی بھی بجا لاتا ہے تو وہ ذرہ نواز قادر و توانا ہستی اُس کو اِس قدر نوازتی ہے کہ اُسے زمین کی پستیوں سے اُٹھا کر افلاک کی رفعتوں کے ہمدوش کر دیتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اُس کے لئے لامتناہی ترقیات کے دروازے

کھول دیئے جاتے ہیں اور وہ خدائے رب العزت کے اِذن اور اُس کی اعانت سے سلوک کی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔

علم اِس قدر شیریں اور مرغوب چیز ہے کہ اس کا طالب کبھی سیر نہیں ہوتا۔ بلکہ جب تھوڑا سا علم حاصل ہونے کے بعد اُسے علم کی حلاوت اور چاشنی کا اندازہ ہوتا ہے تو وہ اس کی جستجو میں دیوانہ وار کوشش شروع کر دیتا ہے اور ہر دم اِس فکر میں سرگرداں رہتا ہے کہ وہ کِن ذرائع سے زیادہ سے زیادہ علوم حاصل کر سکتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے الٰہی نعماء میں زیادتی چاہنے کا ایک یقینی ذریعہ بیان فرمایا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ کہ اے میرے کمزور بندو! تم جس قدر میری نعمتوں پر شکر کرو گے مَیں اُسی قدر تم کو زیادہ نعمتیں دیتا چلا جاؤں گا۔ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ تمہارے شکر کے نتیجہ میں مَیں اپنی رحمت اور فضل سے تمہاری کمزوریوں کی پردہ پوشی کروں گا اور اپنی جناب سے غیر معمولی ترقیات عطا کروں گا۔ یہاں یہ امر قابلِ غور ہے کہ انسان میں اُس وقت تک جذباتِ شکر پیدا نہیں ہوتے جبتک اُسے اپنے مقام اور منصب کا حقیقی اندازہ نہ ہو۔ اس کے بغیر نہ انسانی دماغ میں خدا تعالیٰ کی عظمت کا تصور راسخ ہوتا ہے اور نہ نعماءِ آسمانی کی محسنانہ موہبت کا احساس ہوتا ہے۔ ایک کمزور و حقیر اور نادار انسان جب ایک طرف اپنی کم مائگی کو دیکھتا ہے، اپنی خطاؤں، کمزوریوں اور لغزشوں کا تصور کرتا ہے اور دوسری طرف خدائے ذوالمنن کی بے پایاں رحمت کے سمندر کو موجزن پاتا ہے۔ ارحم الراحمین اور ستار العیوب خدا کے فضل و کرم کے سلوک کو دیکھتا ہے تو شکر و امتنان کے جذبات سے اُس کا دل بھر آتا ہے اور آنکھیں پُرنم ہو جاتی ہیں۔ اِسی مقام پر آکر انسان اپنی اصلی قدر کو پہچانتا ہے اور یہیں سے اُس کی ترقی اور بلندیٔ درجات کا آغاز ہوتا ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مَن عرف نفسہٗ فقد عرف ربّہٗ۔ اِس ارشادِ مبارک میں نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اپنے نفس کے مقام کو پہچاننے سے انسان خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرتا ہے۔ لیکن بعض لوگ اِس مقام کی تعیین کرتے وقت غلطی کا ارتکاب بھی کر لیتے ہیں۔ اگر کچھ لوگ اپنی انکساری اور تواضع میں اس قدر بڑھے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ طاقت و قوت اور ذہنی استعداد رکھنے کے باوجود احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتے ہیں تو بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو بہت بڑا خیال کرتے ہیں اور اِس طرح خود فریبی اور خود پسندی کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ صحیح موقف اور مسلک اِن دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے اور یہ انسان کی بڑی سعادت اور خوش قسمتی ہے کہ وہ اپنے صحیح مقام اور مرتبہ کو پہچانے کیونکہ اِسی میں اس کی ترقی و سربلندی کا راز مضمر ہے۔ اگر انسان کو اپنی طاقتوں اور استعدادوں کا صحیح اندازہ ہو اور اس کے ساتھ مفوّضہ فرائض کی اہمیت کا بھی واجبی احساس ہو تو وہ اپنے تمام وسائل کو اِس طور پر مجتمع کر کے بروئے کار لائے گا کہ بہت جلد لیلائے کامرانی سے ہمکنار ہو جائے گا۔ انسان اپنی زندگی کے کسی مرحلہ پر ہو اور اس جدوجہدِ انسانی کی رزمگاہ میں اُسے کوئی سا مقام حاصل ہو۔ یہ امر بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ اسے اپنے صحیح منصب اور مقام کا علم ہو۔

ادب و احترام اور ہمدردی کے تقاضات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم اپنے ہم مکتب رفیقانِ گرامی قدر کی خدمت میں برادرانہ طور پر یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جب دُنیا کے ہر شخص کو اپنا مقام پہچاننے کی ضرورت ہے تو ان نوجوانوں کو جو ملک و قوم سے ہمدردی اور خلوص کے دعویدار ہیں اور جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انسانیت کی خدمت سرانجام دینے کے عزائم رکھتے ہیں اس بات کی کہیں زیادہ ضرورت ہے کہ وہ اپنے حقیقی مقام کو پہچانیں۔ ہماری مراد طالب علموں سے ہے جن کے متعلق یہ بات ایک تلخ حقیقت کا رُوپ دھار چکی ہے کہ وہ اپنے اصلی فرائض سے اغماض برتتے ہوئے فضول، لغو اور غیر متعلق کاموں میں منہمک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ بات بڑے شد و مد کے ساتھ بیان کی جاتی ہے کہ طلباء قوم کے معمار ہوتے ہیں لیکن گزشتہ سال انہی طلباء کے ہاتھوں سے ملک میں جو تخریبی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں اُن کے افسوسناک نتائج کی کسک ابھی تک دلوں میں باقی ہے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ موجودہ دَور میں طلباء اپنے حقیقی مقام اور منصب کو فراموش کر چکے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں وہ رُوح عنقا ہوتی جا رہی ہے جو ترقی پذیر اقوام کے لئے جزوِ لاینفک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کسی انسان کو کوئی بلند مقام حاصل نہ ہو یا معاشرہ اُسے کوئی بلند منصب دینے پر راضی نہ ہو تو ہم اُس کی کم ہمتی کا جواز تلاش کر سکتے ہیں لیکن یہ کس قدر حیرت انگیز اور افسوسناک مشاہدہ ہے کہ اسلام طالب علم کا ایک بلند مرتبہ بیان کرتا ہے اور اسلامی معاشرہ میں اسے ایک مقامِ فضیلت عطا کیا جاتا ہے لیکن پھر بھی طالب علم اپنی کوتاہ بینی سے اپنے لئے ایک ادنیٰ مقام کو پسند کرتا ہے۔ یہ سراسر گھاٹے کا سودا ہے جو اپنے اندر کفرانِ نعمت کا بھی ایک رنگ رکھتا ہے۔

اگر ہم حقائق کا قریب سے جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس ساری خرابی کی بنیاد عصرِ حاضر کی وہ تہذیبِ نَو ہے جس نے اپنے انتہائی زہریلے اور تباہ کُن نتائج پر بڑی خوبصورتی سے سنہری پردے ڈال رکھے ہیں۔ اس ظاہری چمک دمک اور چکا چوند کا نتیجہ ہے کہ نوجوان طالب علم اس حد تک جلوۂ فرنگ کا شکار ہو چکے ہیں کہ اپنے عواقب سے بے نیاز ہو کر ہلاکت و تباہی کی راہ پر گامزن ہیں ——— اسی بادِ سموم کا نتیجہ ہے کہ طلباء نے ہڑتالوں، جلسے جلوسوں، احتجاجوں اور قراردادوں کو ہی اپنا مقصود قرار دے لیا ہے۔ اپنی تعلیم سے لاپرواہی کا یہ عالم ہے کہ ان کا علمی معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تہذیب و شرافت کے نقوش بھی آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے ہیں۔

یہ انتہائی افسوسناک صورتِ حال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ملک کے نوجوان بیدار ہوں اور ان میں اپنے حقیقی مقام اور منصب کا شعور پیدا ہو۔ خدا کرے کہ وہ اس بات کو سمجھ سکیں کہ طلباء قومی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کا مقام رکھتے ہیں اور انہی کے کندھوں پر قومی فرائض کی ذمہ داریاں عاید ہونے والی ہیں۔

کاش! کوئی شخص اِن نوجوان طلباء کو خوابِ غفلت سے بیدار کرے اور خوب اچھی طرح اس حقیقت کو اُن کے قلب و ذہن میں راسخ کر دے کہ قوم کی عزت و ناموس کی حفاظت، پاسبانی اور ترقی اب اُنہی کے دم قدم سے ہوگی۔ اُنہی کو بدنیت دشمنوں کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملاتے ہوئے قوم و ملک کو نیکنامی عطا کرنی ہے اور انہی کو اب قوم کی نیّا کے کھیون ہارے بن کر اسے ساحلِ مقصود تک پہنچانا ہے۔

قوموں کی زندگی نوجوان پود پر منحصر ہوا کرتی ہے۔ جس دن نئی نسل میں کمزوری اور ضعف کے آثار پیدا ہو جائیں اسی روز سے اس قوم کے زوال کا آغاز ہو جاتا ہے اور یہ سلسلہ آخر کار قوم کی مکمل موت پر منتج ہوتا ہے۔ خدا کرے وہ دن جلد طلوع ہو۔ جب طلباء میں قوم کا درد اور اپنے فرائض کا احساس پیدا ہو، تا وہ اپنے گرد و پیش کے گمراہ کُن ماحول سے یکسر بے نیاز ہو کر تعمیرِ قوم کے کام میں ہمہ تن مصروف ہو سکیں اور اپنے خونِ جگر سے اِس مقدّس ملک کی بنیادیں استوار کرنے کا موجب بنیں جسے ہمارے آباؤ اجداد نے خون کے عمیق سمندر عبور کر کے حاصل کیا تھا۔

ہماری دُعا ہے کہ طلباء ملک و ملّت کے لئے سرخروئی اور سربلندی کا باعث بنیں اور ہماری مملکتِ خداداد کا سبز ہلالی پرچم تا ابد آکاش کی نیلگوں بلندیوں میں لہراتا رہے۔ آمین +

(عطاء المجیب راشد)

اپنی باتیں

- ۱۹۷۴ء کا سالنامہ پیشِ خدمت ہے ــــــ اس شمارہ کو زیادہ سے زیادہ مفید اور دلچسپ بنانے کی ہم نے ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اگر یہ شمارہ آپ کی پسند کے معیار پر پورا اُترے تو یہ امر ہمارے لئے باعثِ مسرت ہوگا۔
- جہاں گُل ہوتے ہیں وہاں خار بھی ہوتے ہیں۔ یہ مشہور و معروف مقولہ آپ نے بارہا سُنا ہوگا لیکن شاید آپ نے کبھی اس امر کا اندازہ نہ کیا ہو کہ جب کوئی شخص اپنا دامن سمیٹتے ہوئے کانٹوں سے بچ بچا کر پھول توڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا دل فرطِ مسرت سے جھوم اُٹھتا ہے ــــــ اس رسالہ کی تدوین میں ہماری بھی یہی کیفیت رہی۔ اس انتخاب میں ہم کس حد تک کامیاب رہے ہیں؟ یہ قارئین کی گرانقدر آراء سے معلوم ہوگا جن کے لئے ہم چشم براہ ہیں!
- اس شمارہ کے لئے نسیم احمد اقبال، محمد اسلم بھٹی، محمد ناصر سیف، حبیب اللہ خان، محمد زکریا، محمد اعظم خان، محمد منظور صادق، حمید ملک، مرزا مبارک احمد، اظہر سلیم، جاوید اکبر ذکی، محمد اکرم سندھی، قاسم رضا، جمیل لطیف، ملک محمد اشرف صابر اور دیگر بہت سے طلباء نے اپنی نگارشات ارسال کی تھیں جو ہم بعض وجوہ سے شامل نہ کر سکے۔ ہم ان سب طلباء کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔
- ہماری یہ زندگی امدادِ باہمی اور تعاون کی بنیادوں پر استوار ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم نے اس شمارہ میں بہت سے طلباء کی نگارشات کو جگہ دی ہے۔ کیا آپ بھی اس حوصلہ افزائی کے صلہ میں اپنی گرانقدر نگارشات ارسال کر کے ادارۂ المنار سے تعاون فرمائیں گے! المنار آپ کا اپنا ترجمان ہے اور اس کے صفحات آپ کی علمی کاوشوں کے آئینہ دار ہیں۔ عزمِ صمیم لے کر اُٹھیئے اور اپنی زندگی کا ثبوت دیجئے!
- ہم اس شمارہ میں ایک انعامی مقابلہ کا اعلان کرتے ہیں۔ مضمون کا عنوان ہوگا "**اصلاحِ معاشرہ میں طالبِ علم کا کردار**"۔ مضمون زیادہ سے زیادہ فل سکیپ سائز کے تین صفحات پر مشتمل ہونا چاہیئے جو یکم نومبر ۱۹۷۴ء تک ہمیں پہنچ جانا چاہیئے۔ اوّل اور دوم آنے والے طلبہ کو مناسب انعام دیا جائے گا جس کا ایک حصہ یہ ہے کہ وہ مضامین المنار کی زینت بنیں گے۔
- اگلے شمارہ کی تیاری بہت جلد شروع کی جا رہی ہے، ابھی سے توجہ فرمائیے!

(ع - م - س) ــــــــــــــــــــ

کلامُ الامامؑ

(سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام)

نورِ فرقاں ہے جو سب نوروں سے اجلیٰ نکلا
پاک وہ جس سے یہ انوار کا دریا نکلا

حق کی توحید کا مُرجھا ہی چلا تھا پودا
ناگہاں غیب سے یہ چشمۂ اصفیٰ نکلا

یا الٰہی! تیرا فرقاں ہے کہ اک عالَم ہے
جو ضروری تھا وہ سب اس میں مہیّا نکلا

کس سے اس نور کی ممکن ہو جہاں میں تشبیہ
وہ تو ہر بات میں ہر وصف میں یکتا نکلا

سب جہاں چھان چکے ساری دکانیں دیکھیں
مئے عرفاں کا یہی ایک ہی شیشہ نکلا

پہلے سمجھے تھے کہ موسیٰ کا عصا ہے فرقاں
پھر جو سوچا تو ہر اک لفظ مسیحا نکلا

اِمَامُ الْکَلَام

(سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالےٰ)

بتاؤں تمہیں کیا کہ کیا چاہتا ہُوں

ہُوں بندہ مگر مَیں خدا چاہتا ہُوں

مَیں اپنے سیاہ خانۂ دل کی خاطر

وفاؤں کے خالق وفا چاہتا ہُوں

جو پھر سے ہرا کر دے ہر خشک پودا

چمن کے لئے وہ صبا چاہتا ہُوں

مجھے بَیر ہرگز نہیں ہے کسی سے

مَیں دُنیا میں سب کا بھلا چاہتا ہُوں

وہی خاک جس سے بنا میرا پُتلا

مَیں اس خاک کو دیکھنا چاہتا ہُوں

نکالا مجھے جس نے میرے چمن سے

مَیں اُس کا بھی دل سے بھلا چاہتا ہُوں

نعت خیر البشرؐ

(حضرت سیّدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہؓ)

السّلام! اے ہادیٔ راہِ ہُدیٰ جانِ جہاں
والصّلوٰۃ اے خیرِ مطلق اے شہِ کون و مکاں
تیرے ملنے سے ملا ہم کو وہ "مقصودِ حیات"
تجھ کو پا کر ہم نے پایا "کامِ دل" آرامِ جاں
آپ چل کر تُو نے دکھلا دی رہِ وصلِ حبیب
تُو نے بتلایا کہ یوں ملتا ہے یارِ بے نشاں
ہے کشادہ آپ کا بابِ سخا سب کے لئے
زیرِ احساں کیوں نہ ہوں پھر مرد و زن پیر و جواں
تشنہ رُوحیں ہو گئیں سیراب تیرے فیض سے
علم و عرفانِ خداوندی کے بحرِ بیکراں
تُو وہ آئینہ ہے جس نے مُنہ دکھایا یار کا
جسمِ خاکی کو عطا کی رُوح اے جانِ جہاں
تا قیامت جو رہے تازہ تیری تعلیم ہے
تُو ہے روحانی مریضوں کا طبیب جاوداں
ہے یہی ماہِ مبیں جس پر زوال آتا نہیں
ہے یہی گلشن جسے چھُوتی نہیں بادِ خزاں

یہ دُعا ہے میرا دل ہو اور تیرا پیار ہو
میرا سر ہو اور تیرا پاک سنگِ آستاں

اِنقطاع اِلی اللہ

(حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ)

سر پہ کھڑی ہے موت ذرا ہوشیار ہو
ایسا نہ ہو کہ توبہ سے پہلے شکار ہو
زندہ خدا سے دل کو لگا اے عزیزِ من
کیا اِس سے فائدہ جو فنا کا شکار ہو
یادِ خدا سے تجھ کو ملے لذّت و سرور
بس تیری زندگی کا اِسی پہ مدار ہو
تجھ کو اُسی کا شوق ہو ہر وقت، ہر گھڑی
ہر دم اسی کے عشق کا سر میں خمار ہو
خالی ہو دل ہوائے متاعِ جہان سے
تجھ کو بس اِک آرزوئے وصلِ یار ہو
یادِ حبیبؐ سے نہ ہو غافل کبھی بھی تُو
اِس بات سے کوئی تیرا مانع ہزار ہو
جاہ و جلالِ دُنیائے فانی پہ لات مار
گر تُو یہ چاہتا ہے کہ تُو باوقار ہو
ہو فکر تجھ کو روزِ جزا کی لگی ہوئی
اور اُس کے غم میں آنکھ تیری اشکبار ہو

احمدؔ یہی دُعا ہے کہ روزِ جزا نصیب!
تجھ کو نبیٔ کریمؐ کا قُرب و جوار ہو

اس شمارہ میں ــــــ

- سالِ گزشتہ کی روداد سالانہ جلسہ تقسیم اسناد و انعامات کے موقع پر شائع نہیں ہو سکی تھی اسلئے اب شاملِ اشاعت ہے۔
- حضرت حافظ محمد مختار احمد شاہجہانپوری کا گرانقدر خطبۂ صدارت بھی جو آپ نے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر تحریر فرمایا تھا شائع کیا جارہا ہے۔
- جناب لطف الرحمٰن محمود کا بیش قیمت ادبی مضمون "اردو شاعری کا زرّیں دَور" اہلِ ادب کے لئے معلوماتی اضافہ کا موجب ہوگا۔ آپ نے اس مضمون میں میر تقی میرؔ اور میرزا سوداؔ کے شاعرانہ اوصاف کا شاندار تجزیہ کیا ہے۔
- عربی ادب میں زمانۂ جاہلیت کے سات قصیدے (سبع معلّقات) ایک امتیازی مقام رکھتے ہیں۔ جناب عطاء المجیب راشد نے ان سات قصیدوں پر ایک شاندار مضمون لکھ کر قارئین کو عربی ادب کے اس پہلو سے متعارف کرایا ہے۔
- داؤد طاہر ہمارے کالج کے ایک ہونہار طالب علم ہیں۔ انہوں نے "تعلیم الاسلام کالج" پر ایک تحقیقاتی مضمون لکھ کر ان قومی ادارہ سے اپنے قلبی لگاؤ کا ثبوت دیا ہے۔
- علم و عمل انسانی حیات کا قیمتی ترین سرمایہ ہیں۔ جناب اقبال نجم نے اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے بڑے احسن پیرایہ میں ہمیں اپنی ذمہ داریوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ان کا مضمون گویا ہمارے دل کی آواز ہے۔
- منگلا ڈیم پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ جناب محمود احمد نے اسی عنوان پر قلم اٹھایا ہے ــــ آپ بھی نئے نئے عناوین ڈھونڈ کر اپنی تعمیری صلاحیتوں کا ثبوت دیجئے!
- ہدایت اللہ ہادی نے "تقلید اور فطرتِ انسانی" جیسے مشکل موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ہم دوسرے طلباء کو بھی اس موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دیتے ہیں۔ ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے!
- افسانوں کے حصہ میں کالج کے طالب علم سعید انجم کی کوشش ایک معیاری کوشش ہے۔ دوسرے دو افسانے بھی پہلے سے کچھ کم نہیں۔
- گلہائے رنگا رنگ میں آپ مختلف رنگ ملاحظہ کریں گے۔ امید ہے آپ بھی خوش ذوقی کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں پسند کریں گے۔
- "شبستانِ غزل" میں ہم جناب ثاقبؔ زیروی، جناب عبدالسلام اخترؔ اور قمر امروہوی کے بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر خاص المنار کے لئے اپنا تازہ کلام ارسال کیا ہے۔ جناب ارشد ترمذی سابق ایڈیٹر المنار نے بھی اپنے المنار کو یاد رکھا ہے ــــ ہم ان کے بھی ممنون ہیں ــــ اس کے علاوہ کالج کے بعض طلباء نے بھی اپنے اپنے اندازِ فکر کو پیش کیا ہے!

(عابد ربانی)

تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ

سالانہ روداد

سنہ ۱۹۶۳-۶۴ء

صاحبزادہ مرزا ناصر احمدؐ
ایم اے (آکسن) پرنسپل

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ * نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ
وَعَلٰی عَبْدِہِ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ

سالانہ رُوداد

تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ

معزز بزرگو و عزیز بھائیو! اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ

امسال جلسہ تقسیم اسناد ایک خاص انداز اور خصوصیت کا حامل ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ خطبۂ جلسہ ہذا مخدومی حضرت حافظ سید مختار احمد صاحب شاہجہانپوری ارشاد فرمار ہے ہیں۔ اگرچہ آپ علالتِ طبع کے باعث بنفسِ نفیس یہاں تشریف فرما نہیں ہیں تاہم ہماری گذارش پر جو خطبہ انہوں نے ارسال فرمایا ہے اسے مکرم محترم مولانا جلال الدین صاحب شمسؔ پڑھ کر سنائیں گے۔

حضرت حافظ صاحب کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ صفِ اوّل کے اُن مجاہدین میں سے ہیں جن کو حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ علیہ السلام کی ذاتِ والا صفات سے براہِ راست کسبِ فیض کا موقع ملا۔ آپ ایک متبحر عالم۔ بے مثال ادیب اور خطیب اور سلسلے کا جیتا جاگتا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ اور پچھلے بہتّر سال سے اسلام کی مدافعت میں دن رات قلمی اور لسانی جہاد میں مصروف ہیں۔ آپ صحابہ کرام کے اس مبارک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو آخرین منھم میں شامل اور اسلام کی حقانیت پر ایک زندہ دلیل کا حکم رکھتے ہیں۔ آپ استاذ الاساتذہ اور شاعر بے بدل بھی ہیں۔ اور منشی امیر احمد امیرؔ مینائی کے شاگردانِ خاص میں سے ہیں۔ ہم ممنون ہیں کہ باوجود علالتِ طبع کے آپ نے ہماری درخواست منظور فرمائی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کا اور آپ کے ساتھی مقدسین کی عمر اور صحت میں برکت ڈالے۔ ہم اس تکلیف فرمائی پر حضرت حافظ صاحب کی خدمت میں جزاکم اللہ احسن الجزاء کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

پیشتر اس کے کہ سالانہ روداد مختصراً آپ کی خدمت میں پیش کروں بعض اہم امور کی طرف آپ کی اور حکومت کے اربابِ حل و عقد کی توجہ مبذول کرانی ضروری سمجھتا ہوں۔

یہ ایک تلخ اور افسوسناک حقیقت ہے کہ ہمارا تعلیمی بحران ابھی ختم نہیں ہوا۔ تعلیمی کمیشن کی مجوزہ اصلاحات معرضِ تنفیذ میں آتے ہی بعض پُراسرار حوادث کا شکار ہوگئیں۔ یہی نہیں بلکہ ان اصلاحات کی "تدفین" کے بعد بعض تخریب پسند سیاستدانوں کے ہاتھوں ایک اور گہرا زخم جو نظامِ تعلیم اور تعلیمی ارتقاء کو پہنچا ہے۔ وہ ناسور کی طرح عرصہ تک رِستا رہے گا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ ماضی قریب میں ان طالع آزما سیاستدانوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ ہمارے طلباء جو ہمارے مستقبل کے ضامن، ہماری امیدوں کا سرمایہ، اور ملک و قوم کی نہایت عزیز اور قیمتی امانت ہیں۔ ان سیاسی ہتھکنڈوں کا لقمہ بن جائیں۔ اور ان کی اقدار کی ہوس، اور سیاسی بھوک کی تسکین کا سامان فراہم کریں۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ جہاں اس قسم کے عناصر ہمارے حال اور مستقبل کی تاک میں بیٹھے ہوں وہاں اربابِ حل و عقد اور قوم کے بیدار محافظ ایک لمحہ کے لئے بھی اس خطرے سے غافل نہ ہوں اور اسے ایک معمولی خطرہ سمجھتے ہوئے سہل انگاری سے کام نہ لیں۔ قومی بقا اور تحفظ کا تقاضا ہے کہ ہماری درسگاہیں ان جراثیم کی دستبرد سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔ ہماری آئندہ نسل کا یہ ایک بنیادی حق ہے کہ اسے تعلیمی اور علمی نشوونما کے لئے کھلی، صاف اور سیاسی تپ دق سے پاک فضا مہیا کی جائے۔ تاکہ اس کی قوتیں منتشر نہ ہوں اور تعلیمی انہماک میں کمی نہ آئے اور وہ صحیح معنوں میں زندگی کے جدید تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو سکیں۔

ہمارے لئے یہ انتہائی شکر اور امتنان کا مقام ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیشہ کی طرح ہمارا تعلیم الاسلام کالج اس ذہنی تکدر اور سیاسی بے راہروی سے ہر طرح محفوظ رہا۔ وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

دراصل ہمارے ملک کے تمام طلبہ ہی فطرتاً شریف، مؤدب اور ملک و قوم کے لئے غیرت رکھنے والے ہیں۔ بشرطیکہ صحیح اور مناسب رنگ میں انہیں اپنے فرائض کا احساس دلایا جائے مگر ہمارے طلبہ اور ہمارے اساتذہ تعلیم و تربیت کو ایک مقدس فرض تصور کرتے ہیں۔ ہمارے پاس بُرے بھلے ہر قسم کے طلبہ آتے ہیں۔ ایک باپ کی حیثیت سے سزائیں بھی دینی پڑتی ہیں۔ اور ایک باپ ہی کی محبت کا سلوک بھی کرنا پڑتا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان عزیزوں کے لئے صحت افزا ذہنی۔ اخلاقی اور جسمانی فضا مہیا کرنا۔ ان کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں کو اجاگر کرنا اور علمی اور اخلاقی نشوونما کی جملہ سہولتیں بہم پہنچانا ہمارا فرض ہے۔ ہمارے نزدیک مسجد کے بعد مدرسے کا تقدس ہے۔ اور ہماری اس درسگاہ میں اللہ تعالیٰ کے فضل سے تعلیم و تربیت کے فرائض عبادت کے رنگ میں سرانجام دیئے جاتے ہیں جہاں رنگ اور مذہب، افلاس اور امارت، اپنے اور بیگانے کی تفریق نہیں۔ جہاں طلباء مقدس قومی امانت ہیں جہاں ماحول خالص اسلامی اور اخلاقی ہے نہ کہ سیاسی۔ جہاں منتہائے مقصود خدمت ہے نہ کہ جلبِ منفعت۔ جہاں غریبی عیب نہیں اور امارت خوبی نہیں۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔

ہمیں اپنے نقائص اور کوتاہیوں کا بھی پورا پورا احساس ہے۔ اور ان کے ازالہ کے لئے ہم حتی الامکان کوشاں بھی رہتے ہیں۔ لیکن یہ کہنے کی اجازت بھی چاہتے ہیں کہ ایسے عظیم اور مثالی ادارے کی کما حقہٗ توسیع و افزائی بھی ضروری ہے جس کے ذرّے ذرّے پر اس کے فدائی اساتذہ اور طلباء نے خونِ دل سے محنت اور اخلاص کی داستانیں لکھی ہیں۔ یہاں اساتذہ ستی

شہرت کی خاطر اپنے فرائض کے تلخ پہلوؤں سے اغماض نہیں برتتے اور نہ ہی طلباء سٹرائیک کی قسم کے غیر اسلامی اور غیر اخلاقی ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ یہاں نہ صرف ملک کے گوشے گوشے سے بلکہ غیر ممالک سے بھی ہر مذہب و خیال کے طلباء اس پُرسکون سادہ اور پاک ماحول سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہماری روز افزوں ضروریات کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ حکومت ہماری سالانہ گرانٹ =/۱۸۰۰۰ روپے سے بڑھا کر کم از کم ایک لاکھ کر دے۔ اور بلڈنگ گرانٹ میں بھی معقول اضافہ کیا جائے تاکہ ہم اپنی توسیع کے ضروری پروگرام کو جلد تر عملی جامہ پہنا سکیں۔ اور ہماری ایم۔اے/ایم۔ایس سی کلاسیں۔ ہوسٹل کی نئی عمارت۔ لائبریری بلاک اور دیگر توسیعی منصوبے قلتِ زر کا شکار ہو کر نہ رہ جائیں۔ حصہ رسدی ہم خود بھی اس بوجھ کو جو دراصل قومی فلاح و بہبود کا بوجھ ہے برداشت کر رہے ہیں۔ صدر انجمن احمدیہ ہر سال ایک خطیر رقم ہمارے خسارے کو پورا کرنے کے لئے ادا کرتی ہے (کالج کے اولڈ بوائز نے بھی کافی حصہ اس بوجھ کا اٹھایا ہوا ہے جو کالج کے بڑھتی ہوئی ضروریات اور تعلیمی کمیشن کے ادھورے نفاذ نے ہمارے ناتواں کندھوں پر لاڈالا ہے) سٹاف کی اعلیٰ تعلیم کا پروگرام بھی اندازے کے مطابق تشکیل پذیر ہو رہا ہے چنانچہ پروفیسر سلطان محمود شاہد پی ایچ ڈی کے بعد لندن سے واپس تشریف لا چکے ہیں۔ مکرم نصیر احمد خان بھی انشاء اللہ امسال پی ایچ ڈی کے بعد واپس تشریف لے آئیں گے اور ان کے ایک سال بعد مکرم ظفر احمد وینس نیز دیگر اساتذہ بھی پی ایچ ڈی کرنے کے بعد واپس آنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں اور کوششوں میں برکت ڈالے اور ہمیں خدمتِ قوم و بنی نوع انسان کی زیادہ سے زیادہ توفیق دے۔ آمین

ان مختصر الفاظ کے بعد خاکسار سالِ رواں کی مساعی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ اصل قابلِ ذکر بات وہ ظاہری کوشش نہیں جسے اس رپورٹ کے جسمانی خطوط متعین کرتے ہیں۔ اصل بات وہ روح ہے جو پسِ منظر میں دن رات کارفرما رہی ہے۔

تعداد طلباء و نتائج

سالِ رواں میں کالج میں طلباء کی تعداد مختلف جماعتوں میں حسبِ ذیل ہے:۔

کلاس	میڈیکل	انجینئرنگ	آرٹس	کل تعداد
XI	۳۹	۶۸	۱۲۵	۲۳۲
XII	۴۲	۶۱	۱۲۱	۲۲۴
بی اے، بی ایس سی I ایئر				۷۴
بی اے، بی ایس سی II ایئر مع آنرز				۱۱۶

کلاس	میڈیکل	انجنیئرنگ	آرٹس	کل تعداد
ایم اے (عربی)				۱۸
			کل تعداد	۶۶۴

امسال مختلف امتحانات کے نتائج کی اوسط فیصد ی مندرجہ ذیل رہی :-

کلاس	میڈیکل گروپ	انجنیئرنگ گروپ	آرٹس گروپ
گیارہویں	۸۵٪	۹۶٪	۹۸،۹٪
بارہویں	۷۱،۴٪	۷۶٪	۴۹،۱٪
بی۔ ایس سی سال اوّل	۸۵٪		
بی۔ اے سال اوّل	۵۰٪		
بی۔ ایس سی آنرز سال دوم	۸۳،۳٪		
،، پاس کورس	۸۸،۸٪		
بی۔ اے ،،	۹۵،۶٪		
ایم اے (عربی)	۶۲،۵٪		

عطاء المجیب راشد طالب علم ایم اے سال اوّل امتحان بی اے (عربی) میں یونیورسٹی میں اوّل رہے اور دو گولڈ میڈل حاصل کئے۔ قریشی اعجاز الحق (ہسٹری آنرز) یونیورسٹی میں اوّل رہے۔ محمد صدیق ایم اے عربی پریویس میں یونیورسٹی میں اوّل رہے اور ناصر الدین اور بشارت الرحمٰن دوم۔

آمد و خرچ

گزشتہ سال کا خرچ	4,10,418.56 روپے ہے
اور گزشتہ سال کی آمد فیس	1,02,674.99
Maintenance grant	18,000.00
Dear ess allowance	5,952.00
Science grant	5,000.00
Library Aid	2,000.00
کل آمد	1,33,626.99

بقیہ رقم ——— 2,76,791.57 روپے
صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے ادا کی گئی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

وظائف و مراعاتِ فیس

گذشتہ سے پیوستہ سال کے ۴۵ کے مقابلہ میں گذشتہ سال ۵۴ طلبہ نے یونیورسٹی۔ بورڈ اور صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے تعلیمی وظائف حاصل کئے۔

گذشتہ سال ۱۷۶ طلبہ کو فیس معافی اور قرضہ حسنہ کی مراعات دی گئیں۔

لائبریری

نئی کتب خرید کردہ دوران سال	۵۷۵
تعداد کل کتب	۹۸۷۵
اخبارات لائبریری	۶
" سٹاف روم	۴
رسالہ جات ہفت روزہ	۱۱
رسالہ جات پندرہ روزہ	۲
رسالہ جات ماہوار	۲۳
رسالہ جات سہ ماہی	۱۰

طلبہ و اساتذہ نے کل ۶۰۰۰ کتب سے استفادہ کیا۔

فضلِ عمر ہوسٹل

سالِ رواں میں خدا تعالیٰ کے فضل سے رہائشی طلباء کی تعداد دو سو سے دو سو پچاس تک رہی۔ گنجائش کی کمی کی وجہ سے ہوسٹل نے چار ملحقہ کوٹھیاں کرائے پر لے رکھی ہیں۔ اندازہ ہے کہ اگر ہوسٹل کی توسیع کی جائے اور ایک نیا ہوسٹل آئندہ سال بن سکے تو اسی نسبت سے کالج کے طلباء کی تعداد بھی بڑھ جائے گی اور محلوں میں رہنے والے طلباء کی اکثریت بھی ہوسٹل میں آسکے گی۔ آئندہ سال تک پانچسو طلباء کی رہائش کا انتظام ضروری ہے۔

دورانِ سال طلباء کی انفرادی اور مجموعی تربیت کا خاص خیال رکھا گیا۔ طلباء کی تعلیمی۔ اخلاقی۔ سٹڈی ٹائم۔

حاضری نماز۔ حاضری ہوسٹل صبح و شام اور دیگر کوائف کی نگرانی کی جاتی رہی۔ اور ہر طالب علم کے والد یا ولی کو اس سلسلے میں مفصل رپورٹ باقاعدگی کے ساتھ ہر مہینے بھجوائی جاتی رہی۔ نماز با جماعت میں اہتمام اور باقاعدگی کا خاص خیال رکھا گیا۔ درسِ قرآن مجید اور درسِ حدیث شریف حسبِ معمول دیا جاتا رہا۔ سگریٹ نوشی اور سینما بینی کی روک تھام کی گئی اور بعض عادی طلباء نے یہ عادت ترک کر دی۔ ہوسٹل کے جملہ انتظامات بشمول کامن روم۔ مَیس۔ لٹریری سوسائٹی۔ طلباء کی باہمی شکایات۔ ان کے فیصلوں کی نگرانی وارڈن ٹیوٹرز اور پریفیکٹس نے کی۔ اور مختلف کمیٹیوں نے ان کا ہاتھ بٹایا۔ والدین اور پرنسپل سے ہر موقع پر رابطہ رکھا گیا خاکسار (پرنسپل) خود بھی گاہے گاہے ہوسٹل میں جاتا رہا۔

مَیس

صدر نسیم احمد

سیکرٹری عبدالغفور احسان

میس کمیٹی جس کے سپرد میس کا انتظام ہے محنت اور تدبّر کے ساتھ مصروفِ کار رہی۔ ایک وقت کے نارمل کھانے کا خرچ ۵½ آنے رہا۔ کمیٹی نے نوکروں کی وردی اور گرم کپڑوں کا انتظام کیا۔ مزید برتن خریدے۔ آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ کے موقع پر مہمان ٹیموں کے کھانے کا انتظام کیا اور کئی دن رات مہمانوں کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہی۔ اسی طرح کالج کی تقریباً تمام اہم تقاریب کے موقع پر میس کمیٹی کی خدمات حاصل رہیں۔ محمد طفیل نسیم نے خصوصاً محنت کے ساتھ کام کیا۔ ناشتہ کمیٹی نے حسبِ سابق سستے ناشتے کا انتظام کیا۔ محترم چوہدری محمد ظفر اللہ خاں اس سلسلے میں اب بھی مدد فرما رہے ہیں۔ محمد ظفر اقبال کا کام قابلِ ذکر ہے۔

یونین ہوسٹل

صدر ناصر احمد

سیکرٹری محمد طفیل نسیم

یونین نے دیگر مجالس کی عمومی نگرانی کی۔ سالانہ عشائیہ کا انتظام کیا جس میں اساتذہ کالج۔ ناظران۔ وکلاء۔ معززینِ شہر اور خاکسار شریک ہوئے۔ سالانہ کیو بیکلز۔ کمروں۔ سیٹوں اور عام صفائی کے مقابلے ہوئے۔ پروفیسر حبیب اللہ خاں۔ مکرم رفیق احمد ثاقب اور مکرم حبیب الرحمٰن نے منصفی کے فرائض انجام دئے۔ اوّل۔ دوم رہنے والوں کو انعامات دئے گئے۔ سالانہ فنکشن کے موقع پر خاکسار پرنسپل نے جانے والے طلباء سے خطاب کیا۔ اور الوداعی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔

کامن رُوم

کامن روم رہائشی طلباء کی گوناگوں دلچسپیوں کا خاص مرکز ہے۔ طلباء مقررہ اوقات میں ان ڈور گیمز کھیلتے ہیں کامن روم کی گہما گہمی اور چہل پہل ہوسٹل کی زندگی کا خاص جزو ہے۔ کامن روم کمیٹی نے ان ڈور کھیلوں کا سالانہ ٹورنامنٹ امسال آل پاکستان سطح پر منعقد کرایا جس کا افتتاح خاکسار (پرنسپل) نے کیا جس میں زرعی یونیورسٹی لائل پور اور سرگودہا کی ٹیمیں شامل ہوئیں۔ یاد رہے کہ اب ٹیبل ٹینس یونیورسٹی کی باقاعدہ کھیل بن چکی ہے۔ ٹورنامنٹ کے مختصر کوائف درج ذیل ہیں :-

اوپن سنگلز میں اطہر احمد میونسپل کالج لائل پور اوّل۔ محمد اکرم زرعی یونیورسٹی دوم رہے۔ ڈبلز میں اطہر احمد عزیز الرحمٰن لائل پور اوّل محمد اکرم عبدالباری لائل پور دوم رہے۔ کلوز سنگلز میں ناصر احمد اوّل مسعود اختر دوم رہے۔ ڈبلز میں سلیمان مسعود اوّل اور ناصر منور دوم رہے۔ جونیئر سنگلز میں انوار احمد اوّل اعجاز الحق دوم اور ڈبلز میں انوار نسیم اوّل احیاء الدین اعزاز دوم رہے۔ اس کے علاوہ کیرم اور ڈرافٹس کے مقابلے بھی ہوئے۔

ہوسٹل کے وارڈن اور سپرنٹنڈنٹ پروفیسر محمد علی چوہدری اور ٹیوٹر مکرم مولانا ارجمند خان اور مکرم سعید اللہ خاں ہیں۔

لٹریری سوسائٹی

نائب صدر — اشرف چوہدری
سیکرٹری — محمد طفیل نسیم

یہ سوسائٹی ہوسٹل کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کی نگران ہے۔ سوسائٹی کے زیر اہتمام دورانِ سال مندرجہ ذیل تقاریر ہوئیں :-

۱۔ پروفیسر بشارت الرحمٰن	ہستی باریتعالیٰ
۲۔ مولانا غلام باری سیف	فضائلِ رمضان
۳۔ مولانا شیخ مبارک احمد	فضائل رمضان اور دعا کی حقیقت
۴۔ پروفیسر محمد علی چوہدری	پاکستان کے جدید خطرات اور طلبہ کی ذمہ داریاں
۵۔ مولوی فضل الٰہی انوری	کچھ سُننے اور کہنے کی باتیں
۶۔ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد	فضائلِ قرآن
۷۔ پروفیسر بشارت الرحمٰن	سوالات و جوابات
۸۔ پروفیسر محمد علی چوہدری	مشرقی پاکستان کا سفر

۹۔ چوہدری عبدالعزیز	نوجوانوں کی اصلاح
۱۰۔ مولانا دوست محمد شاہد	نوجوانوں کے فرائض اور عصرِ حاضر کے تقاضے
۱۱۔ صاحبزادہ مرزا وسیع احمد	طلباء سے خطاب
۱۲۔ محمود سلطان غوث ۱۳۔ ناصر احمد سوقیہ	مارشیس کے حالات
۱۴۔ پروفیسر محمد علی چوہدری	یادِ ایام

اس کے علاوہ خاکسار نے بھی دو دفعہ طلباء سے خطاب کیا۔

لائبریری

انچارج اعجاز الرحمٰن ملک
سیکرٹری مبارک احمد باجوہ

اس سال خدا تعالیٰ کے فضل سے ہوسٹل میں باقاعدہ لائبریری قائم ہوئی جس کا افتتاح صاحبزادہ مرزا وسیع احمد نے کیا۔ فی الحال لائبریری میں دو سو کتب موجود ہیں جن سے طلباء مستفید ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ملک اعجاز الرحمٰن نے نمایاں کام کیا۔

ڈسپنسری

اساتذہ اور طلباء کو مفت طبی امداد دی جاتی ہے نیز ہوسٹل میں صفائی کا اہتمام کیا گیا۔ ڈی ڈی ٹی چھڑکی گئی۔ اکثر حالات میں قیمتی ادویات بھی مفت مہیا کی گئیں۔ طبی امداد دی جاتی رہی۔

پراکٹوریل نظام

چیف پراکٹر	مکرم حمید اللہ ایم اے
پراکٹر	مکرم محمد احمد انور ایم اے
پراکٹر	مکرم محمد اسلم صابر ایم اے
چیف پراکٹوریل مائیٹر	محمد اسلم

ربوہ کے مختلف محلہ جات میں رہنے والے طلباء کی نگرانی کا کام پراکٹوریل نظام کے سپرد ہے۔ ضروری ہے کہ طلباء رات کے وقت مقررہ اوقات میں اپنے گھروں میں موجود رہیں اور وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنی تعلیم کی طرف توجہ دیں۔ نماز باجماعت کی پابندی کریں اور کسی قسم کی آوارگی کے مرتکب نہ ہوں۔ اور مقررہ قواعد ضوابط کی پابندی کریں۔

(۱) ربوہ کے محلہ جات میں رہنے والے طلباء کی نگرانی اور پراکٹرز کی امداد کے لئے حسب دستور طلباء میں سے ہر محلے میں ایک ایک پراکٹوریل مانیٹر مقرر کیا گیا۔ (۲) طلبہ کی محلہ وار فہرستیں تیار کی گئیں۔ (۳) پراکٹوریل مانیٹرز کے علاوہ کالج پراکٹر بھی وقتاً فوقتاً ربوہ کے محلہ جات کا دورہ کر کے اس بات کی نگرانی کرتے رہے کہ طلباء مقررہ اوقات میں غیر حاضر نہ ہوں اور پڑھائی کی طرف توجہ دیں۔ غیر حاضر طلباء سے باز پرس کی جاتی رہی (۴) اس بات کی نگرانی کی گئی کہ طلباء اجازت کے بغیر ہوسٹل سے باہر رہائش نہ رکھیں (۵) کالج یونیفارم سے متعلق قواعد کی پابندی کروائی گئی (۶) اس بات کی کوشش کی گئی کہ طلباء تمباکو نوشی سے احتراز کریں۔ تمباکو نوشی کرنے والے طلباء کو بلا کر فرداً فرداً بھی تمباکو نوشی ترک کرنے کی تلقین کی گئی۔ مزید برآں اس بات کی سختی سے نگرانی کی گئی کہ طلباء برسرِ عام سگرٹ نوشی نہ کریں (۷) کل ۳۲ شکایات کا بعد تحقیق ازالہ کیا گیا۔

مجلس ارشاد

صدر — ملک محمد عبداللہ

نائب صدر — عطاء المجیب راشد

سیکرٹری — انعام اللہ ہاشمی

طلباء میں مذہب سے وابستگی اور روحانی اور اخلاقی اقدار کو اپنانے کا شوق پیدا کرنے اور انہیں صحیح اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے کے لئے کالج میں مجلس ارشاد قائم ہے۔ سالِ رواں کے دوران مندرجہ ذیل تقاریر ہوئیں:۔

۱۔ صاحبزادہ مرزا مبارک احمد وکیل التبشیر — وقفِ زندگی کی اہمیت

۲۔ مولوی منیر الدین احمد مبلغ مشرقی افریقہ — مشرقی افریقہ اور جماعتِ احمدیہ کی تبلیغی مساعی

۳۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود شاہد — انگلستان میں تبلیغِ اسلام کے روشن امکانات

طلباء نے مختلف کالجوں میں انعقاد پذیر ہونے والے "حسنِ قرأت" کے مقابلوں میں شرکت کی۔ جہلم کے مقابلہ حسنِ قرأت میں حافظ محمد سلیم تھرڈ رہے۔ مکرم چوہدری انور حسن ایم اے نے شعبۂ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی میں منعقد ہونے والے مذاکرے میں "افریقہ اور مغربی ممالک بالخصوص امریکہ میں تبلیغِ اسلام کی ضرورت و اہمیت" پر مقالہ پڑھا۔

کالج کے طلباء پر اسلام کی خدمت کیلئے زندگی وقف کرنے کی اہمیت واضح کی گئی اور انہیں تحریک کی گئی کہ وہ حصولِ تعلیم کے بعد وقفِ زندگی کی مبارک تحریک پر لبیک کہیں۔

المنار

حصۂ انگریزی		حصۂ اردو
نگران:	مکرم چوہدری حمید احمد ایم اے	مکرم شیخ محبوب عالم خالد ایم اے
ایڈیٹرز:	پرویز قاسم حسن	عطاء المجیب راشد
	خلیل الرحمٰن	سید شمشاد علی
	محمود احمد	مبارک احمد عابد

عرصۂ زیر رپورٹ میں "المنار" باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ اساتذہ اور طلبہ خاص دلچسپی لیتے رہے۔ ادارہ پروفیسر حبیب اللہ خاں۔ مکرم محمد ارشد اور مکرم جنید ہاشمی کی قلمی معاونت پر خاص طور پر ممنون ہے۔ طلبہ میں پرویز قاسم حسن، مقبول ملک اور مبارک احمد عابد کے مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ دینی اور علمی مضامین کی طرف خاص توجہ دی جاتی رہی۔ اس دفعہ عربی کے صفحات بھی بڑھائے گئے ہیں جو ایک مستحسن تبدیلی ہے۔

مجلسِ عمومی

صدر	مکرم مرزا انس احمد ایم اے
سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ	عبدالرشید شریف
سیکرٹری	صاحبزادہ جمیل لطیف

مجلسِ عمومی کے زیرِ اہتمام مندرجہ ذیل اجلاس ہوئے۔

۱۔ ۱۴ نومبر ۶۳ء۔ اردو و انگریزی مباحثہ موضوع زیر بحث "Life is but empty misery" ۔ اس مباحثہ میں اوّل جاوید حسن۔ دوم جمیل لطیف اور سوم کریم قمر رہے۔

۲۔ ۱۷ نومبر ۶۳ء۔ مولانا نذیر احمد مبشر سابق مبلغ مغربی افریقہ نے "مغربی افریقہ میں اسلام" کے موضوع پر لیکچر دیا اور اپنے ذاتی تجربے بتائے۔

۳۔ ۱۷ نومبر ۶۳ء۔ Mr. Quigley نائب سیکرٹری برٹش کونسل نے "Reading Shakespeare" پر لیکچر دیا۔

۴۔ ۳۱ جنوری ۶۴ء آل ربوہ اردو و انگریزی مباحثہ منعقد ہوا۔ موضوع زیر بحث تھا کہ "طلبہ کے اخلاقی انحطاط کی ذمہ داری موجودہ نظامِ تعلیم پر عائد ہوتی ہے۔"

"The present educational System is responsible for the moral degeneration of the students".

اردو میں اوّل مرزا فرید احمد۔ دوم کریم قمر۔ سوم جاوید حسن رہے۔

۵۔ ۱۳۔ فروری ۶۴ء۔ یہ سوال و جواب پر مشتمل اجلاس تھا جس میں محترم چوہدری محمد ظفر اللہ خان جج عالمی عدالت نے حالاتِ حاضرہ پر حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے۔

۶۔ ۲۸۔ فروری ۶۴ء کو کل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی مباحثہ منعقد کیا گیا۔ موضوع زیر بحث "Common Sense is not so Common" تھا۔

1. Dr. Himmelman جج
2. Mr. De Jeneris
3. Wing Commdr: S. M. Ahmad تھے۔

ٹرافی لاء کالج لاہور نے جیتی۔ دیگر انعامات کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

اوّل۔ سید مشہود احمد آف پنجاب یونیورسٹی

دوم۔ نور محمد چانڈیہ۔ لاء کالج لاہور

سوم۔ خالد حلیم۔ لاء کالج لاہور

انعام خصوصی۔ سید امیر علی شاہ گورنمنٹ کالج جھنگ۔

۷۔ ۲۹۔ فروری ۶۴ء۔ کل پاکستان بین الکلیاتی اردو مباحثہ منعقد ہوا۔

قرارداد زیر بحث: "اسلامی ممالک میں باہمی اتحاد و تعاون ناگزیر ہے۔"

منصفین یہ تھے:۔ ۱۔ جناب مرزا عبد الحق ایڈووکیٹ سرگودہا

۲۔ جناب نسیم صاحب باجوہ

۳۔ جناب شیخ مبارک احمد سابق رئیس التبلیغ مشرقی افریقہ

اس مباحثہ میں ٹرافی انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور نے جیتی۔

انفرادی انعامات کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

اوّل۔ نسیم اختر — میونسپل کالج منڈی بہاء الدین

دوم۔ محمد امین — گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ

سوم - سید ارشد ترمذی | پنجاب یونیورسٹی لاہور
انعام خصوصی - منہاج الدین تبسم | گورنمنٹ کالج سرگودہا

اس مباحثہ میں عطاء المجیب راشد طالب علم تعلیم الاسلام کالج نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔

کالج کے مقررین نے مختلف کالجوں کے آل پاکستان مباحثوں میں شرکت کرکے مندرجہ ذیل انعامات حاصل کیے:۔

۱۔ کریم قمر اور جمیل لطیف نے گورنمنٹ کالج سرگودہا سے اُردو ٹرافی جیتی۔

۲۔ جمیل لطیف اور عبدالحمید نے انجینئرنگ کالج پشاور سے اردو ٹرافی جیتی۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مقررین نے انفرادی انعامات حاصل کیے۔

۱۔ کریم قمر نے گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے اردو مباحثہ میں دوسرا انعام حاصل کیا۔

۲۔ کریم قمر نے گورنمنٹ کالج سرگودہا کے اردو مباحثہ میں اوّل انعام حاصل کیا۔

۳۔ عطاء المجیب راشد نے کالج ہذا کے اردو مباحثہ میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

۴۔ عطاء المجیب راشد نے انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور کے اردو مباحثہ میں خصوصی انعام حاصل کیا۔

۵۔ جمیل لطیف نے انجینئرنگ کالج پشاور کے اردو مباحثہ میں اوّل انعام حاصل کیا۔

۶۔ کالج کی ٹیم جھنگ گورنمنٹ کالج کے اردو مباحثے میں دوم قرار دی گئی۔

بزمِ اُردو

بزم اُردو تعلیم الاسلام کالج کی سرگرم اور فعال بزم ہے۔ اس کے مقاصد میں یہ بات شامل ہے کہ طلبہ کے دلوں میں اپنی قومی زبان اور اس کے ادب سے ساتھ لگاؤ پیدا کیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ملک کے نامور ادباء اور شعراء کے علاوہ دیگر مشاہیر کو بھی دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اُردو میں طلباء سے خطاب فرماویں تاکہ طلباء کی نظروں میں اپنی زبان کا وقار بلند ہو۔ سالِ رواں کے دوران محترم منظور قادر سابق وزیر خارجہ پاکستان و چیف جسٹس عدالتِ عالیہ مغربی پاکستان بزمِ اُردو کی دعوت پر تشریف لائے۔ تقریر فرمائی اور طلباء کے ساتھ تبادلہ خیالات کیا۔ اسی طرح جناب ڈاکٹر زبیڈ۔ اے ہاشمی وائس چانسلر زرعی یونیورسٹی لائل پور نے اس بزم کے اختتامی اجلاس میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شمولیت فرمائی۔ دیگر ادبی سرگرمیوں کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ محترم سہیل بخاری (ایم اے۔ پی ایچ ڈی) پاکستان ائرفورس سکول سرگودہا نے "اُردو داستان گوئی کا فن" کے موضوع پر مقالہ ارشاد فرمایا۔

۲۔ جناب پروفیسر سید وقار عظیم ریڈر شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور نے "کہانی کا فن" کے موضوع پر طلبہ سے خطاب فرمایا۔

۳- محترم ڈاکٹر وزیر آغا ایم اے۔ پی ایچ ڈی نے "نئی نسل اور اُردو زبان کا مسئلہ" کے موضوع پر اپنا مقالہ ارشاد فرمایا۔
اسی طرح ہمارے کالج کے بعض طلباء نے بھی مقالے پڑھے مثلاً

۱- ہدایت اللہ ہادی	"اُردو بحیثیت قومی زبان"
۲- نوید تمیمی	"علامہ اقبال کا نظریۂ وطنیت"
۳- سید شمشاد علی	"اُردو میں تحریفات"

بزمِ اردو کے زیرِ اہتمام ہر سال ایک محفلِ شعر و سخن کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ امسال دو ایسی محفلیں منعقد ہوئیں۔ پہلی محفل میں محترم صوفی غلام مصطفےٰ تبسم مہمانِ خصوصی تھے۔ اس محفل میں مکرم صوفی صاحب کے علاوہ شیر افضل جعفری، مضطر عارفی، پرویز عارفی پرویز پروازی، مجید علی ہاشمی، ارشد ترمذی اور محمد احمد انور نے شرکت کی۔ دوسرے مشاعرے میں جو بزمِ اُردو کا سالانہ مشاعرہ تھا مہمان شعراء میں سے ثاقب زیروی مدیر ہفت روزہ لاہور۔ طفیل ہوشیارپوری مدیر محفل، لطیف انور مدیر مخابرات ریڈیو پاکستان لاہور۔ ہوشی ترمذی ڈائریکٹر پریس برانچ مغربی پاکستان لاہور، شرقی بن شائق مدیر 'نیا راستہ'، ضمیر فاطمی مدیر 'اسلوب' نظر امروہی، عاطر ہاشمی اور مقامی شعراء میں سے پرویز پروازی اور عابد ربانی نے شرکت کی۔

اس بزم کے نگران	مکرم ناصر احمد پرویز پروازی
نائب صدر	شمشاد علی سید
معتمد	عابد ربانی

سائنس سوسائٹی

نگران	پروفیسر حبیب اللہ خاں ایم۔ ایس سی
سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ	عبدالسبحان عادل۔
سیکرٹری	عبدالغفور احسان

سائنس سوسائٹی اپنے دائرۂ عمل میں مصروفِ کار رہی۔ مذہب اور سائنس کے موضوع پر مکرم شیخ مبارک احمد سابق رئیس التبلیغ مشرقی افریقہ نے تقریر فرمائی۔

مجلسِ عربی

سرپرست	پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم اے
نگران	مکرم محمد اسلم صابر۔ مکرم محمد سلطان اکبر

سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ	حبیب الدین احمد
سیکرٹری	عبد الرشید ارشد

۱۔ مجلس عربی کے زیر اہتمام مولانا ابو العطاء سابق مبشر بلادِ عربیہ اور مدیر رسالہ الفرقان نے عربی زبان کی ضرورت و اہمیت کے موضوع پر خطاب فرمایا۔

۲۔ عطاء المجیب راشد ایم۔ اے سال اوّل نے "خلافتِ راشدہ پر ایک نظر" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔

۳۔ حسنِ قرأت کا سالانہ مقابلہ منعقد ہوا جس میں ربوہ کے ادارہ جات کے سترہ طلبہ نے حصہ لیا۔ حافظ محمد سلیم متعلم تعلیم الاسلام کالج نے اوّل، یقین محمد جامعہ احمدیہ ربوہ نے دوم اور نفیس احمد تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ نے سوم انعام حاصل کیا۔

مجلسِ علومِ معاشرت

نگران	مکرم منور شمیم خالد ایم اے
سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ	ضیاء الدین
سیکرٹری	سیّد محمد احمد منصوری

یہ مجلس مجلسِ اقتصادیات اور مجلس سیاسیات کے ادغام کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آئی ہے۔ مجلس کے زیرِ اہتمام صاحبزادہ مرزا طاہر احمد نے "چین و ہند تنازعہ کے پس منظر" کے موضوع پر ایک جامع تقریر کی۔

مجلسِ تاریخ

نگران	مکرم عبد الرشید فوزی ایم اے
سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ	رفیق احمد اسد
سیکرٹری	پروفیسر وحید اسلم

سوسائٹی کے مختلف اجلاس ہوئے۔ پروفیسر انوار حسن چوہدری کا مقالہ "عراق ـــــ سرزمینِ انقلاب" قابلِ ذکر ہے۔

مجلسِ حیاتیات

نگران	مکرم سیّد حبیب الرحمٰن ایم۔ ایس سی
سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ	محمد عظیم خان

سیکرٹری نثار احمد

مجلس نے عرصہ زیرِ رپورٹ میں وادیٔ کاغان اور وادیٔ سیہراں کا دورہ کیا اور وہاں علاقوں کی مخصوص نباتاتی زندگی کا مطالعہ کیا۔ مجلس کے اجلاس باقاعدگی سے ہوتے رہے جس میں طلبہ نے مختلف حیاتیاتی موضوعات پر مقالہ جات پڑھے۔ طلبہ کے علاوہ متعدد ذی علم حضرات نے مقالے پڑھے جن میں سے مندرجہ ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ صاحبزادہ ڈاکٹر مرزا منوّر احمد — "میڈیکل طلبہ کے مسائل"

۲۔ صاحبزادہ مرزا طاہر احمد — "مسئلہ ارتقاء اور قرآنِ کریم"

۳۔ مکرم عبدالشکور اسلم — "تعیینِ جنسی اور وراثت"

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یہ سب مقالہ جات اُردو زبان میں پڑھے گئے۔ اس طرح ایک نئی اور اچھی روایت کا آغاز ہوا۔

مجلسِ فلسفہ و نفسیات

نگران — مکرم مرزا انس احمد ایم اے

سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ — عبدالشکور بھٹی

سیکرٹری — طاہر احمد قاضی

سالِ رواں میں مجلس کے چھ اجلاس ہوئے جن میں سے تین قابلِ ذکر ہیں۔

۔ پروفیسر ڈاکٹر حمیدالدین وائس پرنسپل و صدر شعبۂ فلسفہ گورنمنٹ کالج لاہور نے "تحلیلِ نفسی"۔ پروفیسر عبدالشکور نے "تخلیقِ انسانی" اور مکرم حبیب الرحمٰن سیّد نے "تخلیقِ کائنات" کے موضوعات پر مقالے پڑھے۔

تعلیمِ صحت و ورزشِ جسمانی

شعبہ تعلیمِ صحت و ورزشِ جسمانی کے ماتحت مختلف کلاسوں کی اجتماعی ورزش کے علاوہ رائج الوقت کھیلوں کے جملہ انتظامات کے سلسلے میں سرگرمی سے کام ہوا۔ جسمانی لحاظ سے کمزور طلبہ کو ضروری ورزشیں بتلائی گئیں اور مشورے دئے گئے۔ متعدد طلباء کا ڈاکٹری علاج کروایا گیا۔ یہ سال کالج کی کھیلوں کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ چنانچہ کشتی رانی۔ باسکٹ بال۔ فٹ بال۔ والی بال۔ ہاکی۔ کبڈی۔ کرکٹ۔ سول ڈیفنس۔ رائفل شوٹنگ میں ہمارے کالج نے زونل۔ انٹرزونل اور یونیورسٹی کے مقابلہ جات میں کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور حاصل کی جس کی تفصیل آئندہ سطور میں درج ہے۔ علاوہ ازیں مختلف کھیلوں میں انٹر کلاس میچز ہوئے جمنیزیم کو مزید سامان سے آراستہ کیا گیا۔ اس شعبہ کے انچارج و نگران مکرم محمد احمد انور ہیں۔

کشتی رانی

نگران	مکرم چوہدری حمید احمد ایم اے
جوائنٹ انچارج	مکرم محمد احمد انور ایم اے - ڈی-پی-ای
جنرل سیکرٹری	محمد قاسم خان
کیپٹن یونیورسٹی ٹیم	محمد یار سپرا
کیپٹن بورڈ ٹیم	وریام خاں ظفر

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ ہماری ڈگری ٹیم نے یونیورسٹی کی کشتی رانی کی دوڑوں میں پہلے ہی روز ہیلی کالج آف کامرس کی ٹیم کو ہرا کر کے اپنی دو سال پہلے کی کھوئی ہوئی اوّل پوزیشن حاصل کر لی اور اس طرح یونیورسٹی کی چیمپئن قرار پائی۔ اللہ تعالیٰ یہ کامیابی مبارک کرے۔

یاد رہے کہ دو سال قبل ہم متواتر تیرہ سال سے یونیورسٹی کے چیمپئن چلے آ رہے تھے۔ اس ٹیم میں محمد یار۔ محمد قاسم خان شاہد احمد۔ حمید احمد اور محمد احمد شامل ہیں۔ بورڈ کی ٹیم نے بھی اپنے سابقہ اعزاز کو برقرار رکھا اور بورڈ ریسز میں رنر اپ رہی خدا کرے کہ اگلے سال بورڈ ٹیم بھی جیت جائے اور دریا پر ہماری ہی ٹیموں کی حکمرانی ہو۔

باسکٹ بال

ربوہ باسکٹ بال کے ملک بھر کے تین اہم ترین مراکز میں شمار ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارا سنٹر بورڈ و یونیورسٹی سنٹرل زون کی ٹیموں کو کئی سالوں سے بالعموم اور پچھلے چار پانچ سال سے متعدد معیاری کھلاڑی مہیا کر چکا ہے۔ اس سال پہلی مرتبہ ہمارے ایک کھلاڑی لطیف احمد پاکستان کی نیشنل ٹیم کے لئے بھی منتخب ہوئے جو عنقریب گورنمنٹ کی طرف سے منعقد کردہ ٹریننگ کیمپ میں شامل ہوں گے۔

۲۔ کالج کی ٹیم نے سنٹرل چیمپئن شپ کے مقابلوں میں حصّہ لیا اور معیاری کھیل کا مظاہرہ کیا۔ ہماری ٹیم پہلی مرتبہ صوبہ کی مشہور کلبوں کے مقابلہ پر کھیلی۔ اور سیمی فائنل میں پچھلے سال اور اس سال کی چیمپئن ٹیم سے صرف چند پوائنٹس سے ہار گئی اسکے نتیجہ میں ہمارے پانچ کھلاڑی سنٹرل زون کی ٹیم کے انتخاب کے لئے زیر غور آئے جن میں سے دو اپنی مجبوریوں کی وجہ سے شامل نہ ہو سکے باقی تین یعنی نصیر احمد بُندا۔ لطیف احمد اور عبداللطیف سنٹرل زون کی ٹیم میں شامل ہو کر ڈھاکہ میں منعقد ہونیوالی قومی کھیلوں میں شامل ہوئے۔

۳۔ ہمارا اچھٹا آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ اپنی روایتی شان و شوکت کے ساتھ ۹ تا ۱۱ جنوری کو منعقد

ہوُا۔ کل ۲۷ ٹیموں نے شمولیت کی جن میں ملک کی مشہور مند رجہ ذیل کلبیں بھی شامل ہوئیں :۔

پاکستان ویسٹرن ریلوے۔ پاکستان پولیس۔ برادرز کلب لاہور۔ پاکستان ایئر فورس چک لالہ۔ زرعی یونیورسٹی لائل پور۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کراچی (جو پہلی دفعہ اس ٹورنامنٹ میں شامل ہوئی اور قابلِ تعریف کھیل کا مظاہرہ کیا)

علاوہ ازیں ایف سی کالج۔ اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور کی ٹیمیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ریلوے جو سالِ رواں کی سارے ملک کی چیمپئن ٹیم تھی ایئر فورس سے سیمی فائنل میں ہار گئی۔ کلب سیکشن میں پاکستان پولیس اوّل۔ پاکستان ایئر فورس دوم رہیں۔ کالج سیکشن میں چیمپئن شپ بفضلہٖ تعالیٰ ہمارے کالج نے حاصل کی۔ دوم پوزیشن ایف سی کالج نے جیتی۔ سکول سیکشن میں چیمپئن شپ گورنمنٹ ہائی سکول وحدت کالونی لاہور نے اور دوم پوزیشن تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ نے حاصل کی۔ ٹورنامنٹ ملک کے نامور ریفری صاحبان (جن میں مبارک علی خان اور امین شیخ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے) کی زیرِ نگرانی کھیلا گیا۔

ٹورنامنٹ میں سنٹرل ایسوسی ایشن کے نمائندے۔ انتظامیہ کے ممبران و انتخابی کمیٹی کے اراکین کے علاوہ دور و نزدیک سے معززین اور شائقین کھیل دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ کھیل رات کے وقت بھی بجلی کی روشنی میں ہوتا رہا۔ تمام مہمان کھلاڑیوں کو ایک عشائیہ ربوہ کے شہریوں کی طرف سے دیا گیا۔

اساتذہ کالج کے علاوہ ہم صاحبزادہ مرزا انور احمد اور میاں محمد ابراہیم ہیڈ ماسٹر ... تعلیم الاسلام ہائی سکول کے خصوصیت سے ممنون ہیں جنہوں نے اس ٹورنامنٹ کو کامیاب بنانے کے لئے ہر طرح تعاون فرمایا۔ دستور کے مطابق ٹورنامنٹ کا افتتاح پچھلے سال کی فاتح ٹیم کے کپتان سیّد جاوید حسن پاکستان ریلویز نے کیا۔ اور مارچ پاسٹ کے وقت سلامی لی۔ انعامات کی تقسیم پروفیسر خواجہ غلام صادق چیئرمین سینٹرل ایسوسی ایشن باسکٹ بال ایسوسی ایشن نے کی۔

۴۔ CABBA کی طرف سے ریفریز کا کورس زیرِ نگرانی سیّد اعجاز حسین شاہ سیکرٹری ایسوسی ایشن مبارک علی خان نیشنل کوچ اور امین شیخ جاری کیا گیا جس میں کم و بیش چوبیس ریفریوں نے حصّہ لیا۔

۵۔ پنجاب یونیورسٹی کی ٹیم میں ہمارے کالج کے دو طلبہ نصیر بُندہ اور عبد اللطیف منتخب ہوئے اور انٹر ورسٹی مقابلوں میں کھیلے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یونیورسٹی ٹیم کے کپتان پچھلے سال تک ہمارے کالج کے طالب علم تھے۔

۶۔ ہماری بورڈ کی ٹیم زونل چیمپئن شپ جیت کر انٹر زونل مقابلوں میں شامل ہوئی اور فائنل میں پہنچ کر ایف سی کالج سے ہار گئی اور رنر اپ کی ٹرافی حاصل کی۔ امید ہے کہ اگلے سال ہم انشاء اللہ چیمپئن شپ کا اعزاز حاصل کر سکیں گے۔

۷۔ پنجاب بورڈ کی ٹیم جو انٹر بورڈ مقابلوں کے لئے چُنی گئی اس کے لئے ہمارے چھ طلبہ منتخب ہوئے جن کے نام یہ ہیں: نیاز محمد اکرم سندھی۔ احسان الحفیظ۔ محمد الدین۔ کلیم اللہ۔ محمد عاقل۔

تعلیم الاسلام کالج باسکٹ بال کلب کے صدر پروفیسر محمد علی چوہدری ہیں جو سنٹرل باسکٹ بال ایسوسی ایشن کی مجلسِ عاملہ اور مجلسِ منتخبہ کے رُکن بھی ہیں نیز مشرقی پاکستان میں منعقد ہونے والے اولمپک کھیلوں میں شمولیت کرنیوالی سنٹرل زون کی ٹیم کے مینجر اور

ہوا۔ کل ۲۷ ٹیموں نے شمولیت کی جن میں ملک کی مشہور مندرجہ ذیل کلبیں بھی شامل ہوئیں :۔

پاکستان ویسٹرن ریلوے۔ پاکستان پولیس۔ برادرز کلب لاہور۔ پاکستان ائیر فورس چک لالہ۔ زرعی یونیورسٹی لائل پور۔ وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کراچی (جو پہلی دفعہ اس ٹورنامنٹ میں شامل ہوئی اور قابلِ تعریف کھیل کا مظاہرہ کیا)

علاوہ ازیں ایف سی کالج۔ ہیلی کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور کی ٹیمیں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ریلوے جو سالِ رواں کی سارے ملک کی چیمپئن ٹیم تھی ائیر فورس سے سیمی فائنل میں ہار گئی۔ کلب سیکشن میں پاکستان پولیس اوّل۔ پاکستان ائیر فورس دوم رہی۔ کالج سیکشن میں چیمپئن شپ بفضلہ تعالیٰ ہمارے کالج نے حاصل کی۔ دوم پوزیشن ایف سی کالج نے جیتی۔ سکول سیکشن میں چیمپئن شپ گورنمنٹ ہائی سکول وحدت کالونی لاہور نے اور دوم پوزیشن تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ نے حاصل کی۔ ٹورنامنٹ ملک کے نامور ریفری صاحبان (جن میں مبارک علی خان اور امین شیخ کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے) کی زیر نگرانی کھیلا گیا۔

ٹورنامنٹ میں سنٹرل ایسوسی ایشن کے نمائندے۔ انتظامیہ کے ممبر اور انتخابی کمیٹی کے اراکین کے علاوہ دور و نزدیک سے معززین اور شائقین کھیل دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ کھیل رات کے وقت بھی بجلی کی روشنی میں ہوتا رہا۔ تمام مہمان کھلاڑیوں کو ایک عشائیہ ربوہ کے شہریوں کی طرف سے دیا گیا۔

اساتذہ کالج کے علاوہ ہم صاحبزادہ مرزا انور احمد اور میاں محمد ابراہیم ہیڈ ماسٹر ... تعلیم الاسلام ہائی سکول کے خصوصیت سے ممنون ہیں جنہوں نے اس ٹورنامنٹ کو کامیاب بنانے کے لئے ہر طرح تعاون فرمایا۔ دستور کے مطابق ٹورنامنٹ کا افتتاح پچھلے سال کی فاتح ٹیم کے کپتان سید جاوید حسن پاکستان ریلوے نے کیا۔ اور مارچ پاسٹ کے وقت سلامی لی۔ انعامات کی تقسیم پروفیسر خواجہ غلام صادق چیئرمین سنٹرل امیچور باسکٹ بال ایسوسی ایشن نے کی۔

۴۔ CABBA کی طرف سے ریفریز کا کورس زیر نگرانی سید اعجاز حسین شاہ سیکرٹری ایسوسی ایشن مبارک علی خان نیشنل کوچ اور امین شیخ جاری کیا گیا جس میں کم و بیش چوبیس ریفریوں نے حصہ لیا۔

۵۔ پنجاب یونیورسٹی کی ٹیم میں ہمارے کالج کے دو طلبہ نصیر بندہ اور عبد اللطیف منتخب ہوئے اور انٹر ورسٹی مقابلوں میں کھیلے۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ یونیورسٹی ٹیم کے کپتان پچھلے سال تک ہمارے کالج کے طالب علم تھے۔

۶۔ ہماری بورڈ کی ٹیم زونل چیمپئن شپ جیت کر انٹر زونل مقابلوں میں شامل ہوئی اور فائنل میں پہنچ کر ایف سی کالج سے ہار گئی اور رنر اپ کی ٹرافی حاصل کی۔ امید ہے کہ اگلے سال ہم انشاء اللہ چیمپئن شپ کا اعزاز حاصل کر سکیں گے۔

۷۔ پنجاب بورڈ کی ٹیم جو انٹر بورڈ مقابلوں کے لئے چنی گئی اس کے لئے ہمارے چھ طلبہ منتخب ہوئے جن کے نام یہ ہیں: فیاض مصلح اکرم سندھی۔ احسان الحفیظ۔ محمد الدین۔ کلیم اللہ۔ محمد عاقل۔

تعلیم الاسلام کالج باسکٹ بال کلب کے صدر پروفیسر محمد علی چوہدری ہیں جو سنٹرل باسکٹ بال ایسوسی ایشن کی مجلس عاملہ اور مجلسِ منتخبہ کے رکن بھی ہیں نیز مشرقی پاکستان میں منعقد ہونے والے اولمپک کھیلوں میں شمولیت کرنے والی سنٹرل زون کی ٹیم کے مینجر اور

کوچ بھی ہیں۔ کلب کے نائب صدر مکرم ایم اسلم قریشی ایم۔ ایس سی ہیں جو سنٹرل باسکٹ بال ایسوسی ایشن کے ایسوسی ایٹ سیکرٹری اور مجلسِ عاملہ کے رکن بھی ہیں۔ بورڈ ٹیم کے کپتان نیاز مصلح۔ یونیورسٹی ٹیم کے کپتان سراج الحق اور پنجاب ٹیم کے کپتان عبداللطیف ہیں۔ کلب کے سیکرٹری نصیر احمد ثینده ہیں۔

ہاکی

نگران	مکرم عبدالرشید غنی ایم۔ ایس سی
کیپٹن	پرویز اسلم
سیکرٹری	مبشر احمد

بورڈ کی ہاکی ٹیم نے امسال گورنمنٹ کالج میانوالی کو جو کئی سال سے ہماری زون کا چیمپئن چلا آرہا تھا شکست دی۔ اور زونل چیمپئن شپ حاصل کر لی الحمد للہ۔ پرویز اسلم اور نسیم سیفی کا کھیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

فٹ بال

نگران	مکرم عزیز احمد طاہر ایم اے
کیپٹن ڈگری	عبدالعلیم
کیپٹن بورڈ	منیر احمد باجوہ

بورڈ کے ٹورنامنٹ میں زونل فائنل میں ہماری ٹیم نے گورنمنٹ کالج میانوالی کی ٹیم کو ایک کے مقابل پر پانچ گول سے ہرا کر زونل چیمپئن شپ جیت لی۔ الحمد للہ۔ ان میچوں میں محمد صدیق، عصمت اللہ، محمد عاقل، نعیم الدین اور منیر باجوہ نے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اسی طرح ہمارے کالج کا ایک طالب علم محمد عاقل خان سیکنڈری بورڈ کی فٹ بال کی ٹیم [illegible] T میں منتخب کیا گیا۔

ڈگری ٹیم نے یونیورسٹی ٹورنامنٹ میں دو میچ گورنمنٹ کالج راولپنڈی اور گارڈن کالج راولپنڈی کے ساتھ کھیلے اور ہماری ٹیم دونوں کو صفر کے مقابلے میں علی الترتیب ایک اور دو گول سے شکست دے کر زونل فائنل میں پہنچ گئی۔ یونیورسٹی کے میچوں میں خلیل احمد اور رفیق احمد کا کھیل نہایت شاندار رہا۔ ڈگری اور ٹیموں کے سیکرٹری مبارک باجوہ اور منور ملک ہیں۔

کبڈی

نگران	مکرم محمد شریف خالد ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی

کیپٹن ڈگری — محمد قاسم خان
کیپٹن بورڈ — مظفر اسد ظفر

بورڈ ٹیم زونل مقابلوں میں رنر اَپ رہی۔ ڈگری ٹیم اگرچہ کوئی پوزیشن حاصل نہ کر سکی لیکن اس کے ایک کھلاڑی محمد قاسم کو یونیورسٹی کے نمائندگی مقابلے کے لئے منتخب کر لیا گیا۔

سول ڈیفنس

نگران — پروفیسر محمد علی چوہدری ایم۔اے
کیپٹن — سراج الحق
سیکرٹری — محمود احمد

گورنمنٹ کی طرف سے منعقدہ مری کیمپ میں ہمارے دستے نے شرکت کی۔ مجموعی لحاظ سے کالج کی ٹیم نے پورے نظم و ضبط کا ثبوت دیا اور افسرانِ بالا نے ان کے کام کو سراہا۔ سراج الحق قریشی نے Best in all Subjects کا پہلا انعام حاصل کیا اور ٹرافی جیتی۔

بیڈمنٹن

نگران — مکرم منور شمیم خالد ایم اے

کالج کا سالانہ بیڈمنٹن ٹورنامنٹ کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا جو ڈگری اور بورڈ دو سیکشنوں میں کھیلا گیا۔ یونیورسٹی سیکشن کے سنگلز میں طاہر احمد اوّل اور ڈبلز میں طاہر اور اسحٰق اوّل گلزار احمد اور اللہ یار دوم رہے۔ بورڈ سیکشن میں حنیف سنگلز میں اوّل نعیم حنیف ڈبلز میں اوّل اور ظفر اور رضا دوم رہے۔ حنیف احمد سال کے بہترین کھلاڑی قرار پائے۔ اور ٹرافی کے مستحق ہوئے۔

ٹیبل ٹینس

فضلِ عمر ہوسٹل یونین کے زیرِ اہتمام آل پاکستان ٹیبل ٹینس ٹورنامنٹ ہوا جس کے نتائج پہلے درج ہو چکے ہیں۔

رائفل شوٹنگ کلب

نگران — مکرم محمد علی چوہدری ایم اے

کیپٹن — طاہر احمد
سیکرٹری — خضر حیات مانگٹ

امسال پہلی مرتبہ پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے رائفل شوٹنگ کے مقابلہ جات ہوئے۔ ہم ایک عرصے سے اس کی کوشش کر رہے تھے کہ کالج میں یہ ضروری کھیل شروع کی جائے لیکن یو۔ او۔ ٹی۔ سی کے بعد سے کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔ طاہر احمد کیپٹن نے انفرادی مقابلوں میں یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ الحمدللہ

کرکٹ

نگران — مکرم مرزا خورشید احمد ایم اے
کیپٹن — مبارک احمد
سیکرٹری — نثار احمد شیخ

ہماری بورڈ کی ٹیم نے بورڈ کرکٹ ٹورنامنٹ میں نہایت شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ مخالف کالج کے دونوں اننگز کی ۶۰ رنز کے مقابل ہمارے کالج نے ۴۰۹ اور ۵۳۲ رنز یعنی کل ۹۴۱ رنز بنائیں۔ مبارک ۱۸۵ مبشر ۱۲۰ نثار شیخ ۱۱۴ رفیق ۱۲۵ ناٹ آؤٹ رہے۔ طارق زیدی نے ۲۵ رنز نو وکٹیں لیں اور ۸۸۱ رنز پر میچ جیتا جو کہ بورڈ کا ریکارڈ ہے۔ فائنل میں ہماری ٹیم سرگودہا ۲۳۲ رنز پر ہار گئی۔ اور رنر اپ رہی۔ مکرم سید حبیب الرحمٰن کلب سے ہر طرح تعاون کرتے رہے ہیں۔

ہائکنگ۔ ماؤنٹینیرنگ اور یوتھ ہاسٹلنگ کلب

نگران — محمد علی چوہدری ایم۔ اے
کیپٹن — منصور احمد
سیکرٹری — اشفاق احمد

یہ کالج کی قدیم ترین کلب ہے اور ملک بھر کی فعال ترین کلبوں میں سے ہے۔ امسال ہماری سالانہ مہم نیلم ویلی کے راستے درہ نوری ناڑ کی طرف بھیجی گئی جو تقریباً ایک ماہ کے سفر کے بعد بخیر و خوبی کاغان کے راستے واپس پہنچی۔ الحمدللہ۔ پارٹی نیلم ویلی کے راستے دواریاں اور رتی گلی نالے کے راستے دوکھی گلی کے درّے کو پہلے ہی عبور کر چکی تھی۔ اس مرتبہ پارٹی دواریاں ... سے آگے کیل تک پہنچی۔ یہاں وادئ نیلم کافی کھل جاتی ہے اور دریا بھی سرینگر کی طرح خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔ نیلم ویلی کا یہ حصہ نہایت سرسبز اور شاداب ہے۔ انتہائی شمال میں ہونے کی وجہ سے شاردا سے اوپر کیل تک ویلی میں تدم قدم پر جون کے مہینے میں بھی برف موجود تھی اور آٹھ گلیشیئر تو کافی بڑے بڑے تھے۔ شاردا سے نوری ناڑ درے کی طرف روانہ ہوئے

چاروں طرف برف سے ڈھکی ہوئی فلک بوس چوٹیاں نظر آتی ہیں۔ اصل چڑھائی سے پہلے تقریباً ایس روز روزانہ دس گھنٹے کے پیدل سفر کی ٹریننگ دی جا چکی تھی لیکن یہ چڑھائی اوکھی گلی سے بھی سخت ثابت ہوئی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ابھی راستہ کھلا نہیں تھا اور درّے کو عبور کرنے کا صحیح وقت ابھی نہیں آیا تھا۔ درّے کو ہم نے چار دن میں عبور کیا اور چاروں دن صبح سے شام تک نہایت صبر آزما اور دشوار ترین مراحل سے گذرنا پڑا۔ الحمد للہ کہ کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔ اگرچہ ہمارے چند دن کے بعد ایک پارٹی ہمارے ہی راستے نورد ناڑ کو کراس کرتے ہوئے ایک جان سے ہاتھ دھو بیٹھی اور بعض اخباروں میں غلطی سے ہمارا نام شائع ہوگیا۔ درّہ برف سے بھرا ہوا تھا۔ سورج کی چمک سے سنو گلیئر بھی بے حد تھی۔ Marmot جو قطبین کا جانور ہے اس راستے میں بہت ہے اور اتنا موٹا اور بڑا کہ دوربین کے ذریعہ دیکھنے کے بعد بھی یہی شک پڑتا ہے کہ برفانی ریچھ ہے۔ درّہ پار کرنے کے بعد برف پر glissading بھی کی اور ایک منزل نیچے جل کھڈ میں خیمہ زن ہوئے۔ یہاں بھی چاروں طرف برف تھی یا پھول اور گھاس کے تختے تھے۔ جل کھڈ قابلِ دید جگہ ہے اور اپنی خوبصورتی اور شان میں منفرد ہے۔ پارٹی کو بارہا یہ واقعہ پیش آیا کہ جب بھی پہاڑی لوگوں کو بتایا کہ ہم درّہ پار کر کے آئے ہیں۔ ان کو یقین نہ آیا اور حیرت زدہ ہو کر تعریف کرنے لگے۔ الحمد للہ۔ پارٹی نے درّے کی متحرک فلم بھی لی ہے۔ پارٹی آزاد کشمیر کے مجاہدین، ان کے افسران۔ فارسٹ ڈیپارٹمنٹ خاص طور پر کنسرویٹو صاحب ڈی ایف او آٹھ مقام۔ ریونیو ڈیپارٹمنٹ۔ پولیس افسران کے ممنون ہیں کہ انہوں نے تعاون فرمایا اور پارٹی کو ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی اور مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ پارٹی نے جگہ جگہ باسکٹ بال کے میچ کھیلے۔ ہم خاص طور پر کمانڈنگ آفیسر کیل اور ان کے سیکنڈ ان کمانڈ کے ممنون ہیں۔ اسی طرح پرنسپل صاحب مظفر آباد اور ہیڈ ماسٹر صاحب گورنمنٹ ہائی سکول بالاکوٹ اور ایبٹ آباد کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اختتامیہ

آخر میں میں اپنے عزیزوں سے کہوں گا کہ آپ درسگاہ کی تعلیم سے فارغ ہو رہے ہیں مگر تعلیم سے فارغ نہیں ہو رہے علم ایک بحرِ بے کنار ہے اس لئے ایک انسان علم میں خواہ کس قدر ترقی کر جائے علم ختم نہیں ہوتا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۔ کہدے کہ اگر سمندر کو سیاہی بنا کر اس سے خدا تعالیٰ کی معرفت کی باتیں اس کے دیئے ہوئے علوم اور قدرت

کے راز ضبطِ تحریر میں لانا چاہو تو وہ ایک سمندر کیا اس جیسا ایک اَور سمندر بھی لے آؤ تو وہ بھی ختم ہو جائے گا مگر خدا کی باتیں اور اس کے دیئے ہوئے علوم ختم نہ ہوں گے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اور حضورؐ کی اتباع میں ہر مسلمان کی زبان سے یہ کہلوایا کہ رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔ اے اللہ مجھے اپنی معرفت اور علم میں بڑھاتا چلا جا۔ پس علم کبھی نہ ختم ہونیوالی چیز ہے اس لئے آپ تادمِ حیات علم کی جستجو میں رہیں اور اس کے حصول کے لئے ہمیشہ کوشاں رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کے ساتھ ہو۔ آمین

خاکسار مرزا ناصر احمد ایم۔ اے (آکسن)

پرنسپل تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ

۱۹۔ اپریل ۱۹۶۴ء

اقوالِ زرّیں

• علم کی بردباری یہ ہے کہ تم نااہل کو علم ودیعت کرنے کی کوشش کرو۔

• عالم کی لغزش سے بچو، کیونکہ اس کی لغزش جہنم میں گرا دیتی ہے۔

(بشکریہ چوہدری شریف احمد بی۔ اے)

مقالات و مضامین

• حضرت حافظ مختار احمد شاہجہانپوری

• لطف الرحمٰن محمود

• عطاء المجیب راشد

• داؤد طاہر

• اقبال احمد نجم

• محمود احمد

• ہدایت اللہ ہادی

خطبۂ جلیلہ

بمورخہ ۱۹ - اپریل ۱۹۶۲ء کو تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد و انعامات میں حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدیمی اور مخلص صحابی سلسلہ عالیہ احمدیہ کے جید و متبحر عالم اور ممتاز خادم حضرت حافظ سید مختار احمد صاحب شاہجہانپوری (جو جناب امیر مینائی کی یادگار بھی ہیں) نے کالج کے فارغ التحصیل طلباء کو جس پُرمغز اور ایمان افروز خطبہ سے نوازا تھا اس کا مکمل متن ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ اس قیمتی خطبہ کا ایک ایک لفظ اس قابل ہے کہ اس درسگاہ کا ہر طالب علم اسے غور سے پڑھے اور اپنی تعلیمی زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرے۔

(مدیر اعلیٰ)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ٭ نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

وَعَلٰی عَبْدِہِ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ

معظمی و محترمی حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب و عزیزان و برادران گرامی قدر

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ

الحمد للہ کہ آپ نے تعلیم الاسلام کالج کی تقریب تقسیم اسناد میں اس خاکسار کو یاد فرمایا۔ جزاکم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔

افسوس کہ میں خرابی صحت اور شدت ضعف و نخافت کی وجہ سے جسمانی شمولیت سے معذور ہوں اور بہ نیت امتثال امر ان الفاظ کے ذریعہ سے جو خود لکھے ہوئے نہیں بلکہ لکھوائے ہوئے ہیں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں وباللہ التوفیق۔

تعلیم الاسلام کالج میرے پیارے آقا و مولیٰ جری اللہ فی حلل الانبیاء حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لگایا ہوا پودا ہے۔ اور جو عزیزان باتمیز یہاں سے فارغ التحصیل ہو کر جا رہے ہیں وہ اس کے پھل ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے لیکن عمدہ سے عمدہ درختوں میں آنے والے پھل بھی کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جنہیں کیڑا کھا جاتا ہے۔

کچھ ایسے جو پرندوں اور حشرات الارض کے کام آتے ہیں، کچھ ایسے جنہیں موسمی حادثات پختگی سے پہلے ہی شاخوں سے جدا کر دیتے ہیں اور کچھ ایسے جو مراد تک پہنچ کر خلق اللہ کو محظوظ و مسرور کرتے اور طرح طرح کے فائدے پہنچاتے ہیں۔ اسلئے آپ کا یہاں سے کامیاب ہو کر جانا جہاں ہم سب کے اور خود آپ کے لئے طمانیت و بشاشت کا باعث ہے وہاں فکر و تدبر کا موجب بھی۔ اس لئے کہ اب آپ ہمیشہ تعلیم الاسلام کالج کے فرزندوں کی حیثیت سے دیکھے جائیں گے۔ آپ کی تمام حرکات و سکنات اور آپ کا ہر قول و فعل ایک آئینہ ہوگا جس میں صاحبانِ فکر و نظر تعلیم الاسلام کالج کی تصویر دیکھنا چاہیں گے وہ آپکی گفتار و کردار اور آپ کی روحانی صحت و توانائی سے اس شجر کی حالت و کیفیت کا اندازہ لگائیں گے جس کے آپ ثمر ہیں۔ آپ کے کندھوں پر بہت بڑا بوجھ اور ایک عظیم ذمہ داری آگئی ہے۔ جب تک آپ کالج میں تھے آپ کے مربی و شفیق اساتذہ آپ کی راہ نمائی کے لئے موجود تھے جو آپ کی غلطی پر گرفت کرنے اور آپ کی کمزوری پر حوصلہ دلانے اور آپ کی راہیں متعین کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ و کوشاں رہتے تھے لیکن اب آپ ذہنی اور اخلاقی بلوغت حاصل کر چکے ہیں اور یہاں سے جا رہے ہیں آپ کو خود ہی اپنا مربی و اتالیق بننا ہوگا۔ اب آپ کو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کی یاد دہانی نہیں کرائی جائے گی۔ آپ خود ہی انہیں یاد رکھیں گے اور ان کے مطابق گامزن ہوں گے۔ بظاہر تو یہ راہ بڑی پیچیدہ ہے اور آپ کا منزلِ مقصود تک پہنچنا نہایت دشوار لیکن اگر آپ نے وہ سبق جو اس عظیم ادارہ میں پڑھا ہے اچھی طرح یاد رکھا اور اس کے مطابق عمل کرنے کا تہیہ کر لیا تو انشاء اللہ تعالیٰ آپ کو تسلی و اطمینان اور اعتماد سے میدانِ عمل میں گرم رفتار ہو جانا کوئی مشکل امر نہ معلوم ہوگا۔ اور آپ ضرور منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔

یاد رکھئے جس عظیم الشان مردِ خدا نے میرے ماں باپ اس پر قربان، اس ادارے کی ابتدا فرمائی تھی وہ سکول یا کالج جاری کرنے کے لئے تشریف نہیں لایا تھا۔ یہ کام تو اور بہت سے ادارے بھی انجام دے رہے تھے اور دے رہے ہیں تعلیم الاسلام کالج یا سکول کے اجراء سے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ مقصد تھا کہ ہمارے نوجوان زندگی کے نو بنو تقاضوں سے صحیح معنوں میں عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو جائیں اور اسلام کی آخری جنگ میں جدید سامانِ حرب سے مسلح ہو کر شمولیت اختیار کر سکیں۔ اس کالج کا مقصد آپ کو گریجوایٹ بنانے کے ساتھ ساتھ بہتر انسان بنانا بھی ہے۔ محض علم نہ صرف بیکار ہے بلکہ بعض اوقات خطرناک بھی۔ دنیا سائنسی ترقی کے منہ زور گھوڑے پر سوار بڑی فطانت و مہارت سے اپنے مزعومہ مقاصد کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے لیکن اگر کوئی شخص یورپ یا امریکہ تو کیا چاند اور مریخ تک بھی چکر لگا آئے تو اس سے وہ بہتر انسان نہیں بن سکتا۔ اس لئے یونیورسٹی کے نصاب پر جسے آپ نے ختم کر کے کامیابی حاصل کر لی ہے بس کرنا ہرگز کافی نہیں بلکہ آپ کا اس نصاب میں بھی پاس ہونا ضروری ہے جسے اللہ تعالیٰ نے آپ اور ہم سب کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے:۔

یعلّمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم

یہ ایسا نصاب ہے جس پہ زندگی کی آخری سانس تک عمل کرنا ضروری ہے۔ یہ علم و حکمت اور طریق تزکیہ سکھلانے والا نصاب انسانوں کا مجوزہ و خود ساختہ نہیں بلکہ اس قوی و قادر اور علیم و خبیر کا نازل فرمایا ہوا ہے جس کے قبضۂ قدرت سے کوئی شے باہر اور جس کی نظر سے کوئی چیز مخفی نہیں۔ اور اس نصاب کے رموز و اسرار بتانے اور سمجھانے والے رحیم و کریم استاذ سیدنا و شفیعنا حضرت سید المرسلین و خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ اور حضورؐ نے اس نصاب کے تمام رموز و اسرار براہ راست عزاسمہٗ و جلّ شانہٗ سے حاصل کئے ہیں جو ہر علم و حکمت اور نیکی کا پہلا اور آخری سرچشمہ ہے۔

اے عزیزانِ ہمایوں خصال! علم تو آپ نے سیکھا۔ اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے خوب سیکھا، کامیابیاں بھی حاصل کیں، اور خوب حاصل کیں، مقابلے کے میدانوں میں ممتاز و سرفراز بھی رہے اور خوب ممتاز و سرفراز رہے لیکن یاد رکھیں کہ آپ کا علم اور آپکی کامیابیاں، آپ کو نیکی، طہارت، تزکیۂ نفس اور تعلق باللہ کا مبارک پیغام بھی دے رہی ہیں۔ آپ صرف گریجوایٹ ہی نہیں بلکہ بفضلہ تعالیٰ تعلیم الاسلام کالج کے گریجوایٹ ہیں۔ آپ پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ آپ دین کو دنیا پر مقدم رکھیں گے۔ آپ دنیا کو فتح کریں (اور انشاء اللہ ضرور فتح کریں گے) لیکن اپنی خاطر نہیں بلکہ اپنے پیارے دین اسلام کی خاطر۔ آپ چاند کیا نظام سماوی کی سیر کر آئیں لیکن اپنی خاطر اور اپنی عظمت ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ اپنے خالق و مالک اللہ تعالیٰ عزّ اسمہٗ و جلّ شانہٗ کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے۔ اور پھر اپنے ہادیٔ پاک صاحبِ لولاک سیدنا حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے۔ آپ علم و حکمت سیکھیں لیکن تقویٰ و طہارت کے حصول و قیام کی کوشش کے ساتھ۔ آپ ہر حال میں اسلام کے جیتے جاگتے چلتے پھرتے نمونے نظر آئیں۔ آپ کا ہر قول و فعل، آپ کے تمام حرکات و سکنات، آپ کی دوستیاں اور آپ کی مجلسیں، آپ کے کھیل اور آپ کے مقابلے، آپ کی کارگزاریاں اور آپ کی کامیابیاں اسلام کی خاطر اور اسلام کی رُوح کے مطابق ہوں۔ آپ کا کام ساری دنیا کو اسلام کی آغوش میں لانا ہے۔ آپ کا کلم اکنافِ عالم میں سیدنا حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا پرچم لہرانا ہے۔ آپ کا کام کفر و اسلام کی اس آخری جنگ میں ایک فریس، جری، سربکف اور جاں باز مردِ میدان کا کردار دکھانا ہے۔ آپ کا ہر کام بہت بڑا ہے اور نتیجہ تک پہنچنے کا فاصلہ بہت لمبا۔ چلنے سے پہلے اپنے نفسوں کا محاسبہ کر لیں کہیں بیمار بھیل کی طرح کوئی کیڑا تو موجود نہیں ہے جو اندر ہی اندر نقصان پہنچانے کا موجب ہے۔ کبر، غرور، خود پسندی، خود نمائی، طمع و حرص، بدظنی و عیب چینی اور بخل و اسراف بڑے زہریلے کیڑے ہیں اور کپل کر نیست و نابود کر دیئے جانے کے لائق۔ آپ علم حاصل کریں اور اس پر عمل کرنے میں پوری کوشش سے کام لیں۔ آپ اپنے کالج کے شعار "علم و عمل" کو ہمیشہ یاد رکھیں۔ اپنے اُستادوں کی عزت کریں کہ اسلام اس کی بڑی تاکید کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس استاذ ازل سے اپنا تعلق استوار کرنے کی کوشش کریں جس کے بغیر تمام کامیابیاں بے فائدہ ہیں اور ساری سرفرازیاں بے کار۔ قرآنِ کریم کو اپنا لائحہ عمل بنائیں اور اس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کائیں اور اس کی لائی ہوئی تعلیم پر اچھی طرح قائم ہو جائیں۔ عشقِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رُوح کی غذا بنائیں یہاں تک کہ آپ کے ہر قول و فعل سے انوارِ عشقِ رسولؐ ظاہر ہو جائیں۔ آپ دوسروں کو اسلام کی عظمت ہرگز نہیں منوا سکتے تاوقتیکہ اس کی عظمت خود آپ کے دل میں راسخ

نہ ہو چکی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے بڑی فتوحات مقدر کی ہیں۔ اگر آپ اپنے فرائض کو ادا کرتے رہے تو آپ کا خالق و مالک آپ سے راضی ہو جائے گا۔ اور آپ کو حیاتِ جاوید عطا فرما دے گا اور آپ کا نام رہتی دنیا تک عزت و احترام سے لیا جائے گا۔ آپ آج اپنے دلوں میں یہ عہد کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو امانت ہمارے سپرد فرمائی ہے اس کے ادا کرنے کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ ہو اور اس کے فضل و کرم اور رحمت و نصرت کا سایہ آپ کے سروں پر قائم رہے۔ آپ کو قوموں کی اصلاح کا اہم بالشان کام سپرد کیا جانیوالا ہے اس لئے پہلے آپ اپنی اصلاح کریں۔ آپ اچھے سائنسدان اچھے فلسفی، اچھے ادیب اور اچھے کھیلنے والے کھلاڑی ہونے کے ساتھ اچھے انسان بلکہ نمونے کے انسان بننے کی بھی کوشش کریں آج دنیا کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کا وجود بہت قیمتی ہے۔ آپ بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ کے سپرد وہ کام کیا گیا ہے جو مدتہائے دراز سے کسی کے سپرد نہیں کیا گیا تھا اور زمانہ سالہا سال سے جس کا متقاضی تھا۔ اگر آپ کے ہاتھ سے وہ کام انجام پا گیا تو کون ہے جو آپ کی کامیابی پر خوش نہ ہو گا۔ اور کس کے دل سے آپ کے لئے دعا نہ نکلے گی۔ آپکی عالی ہمتی پر قومیں رشک کریں گی اور آپ نہایت عزت و محبت سے یاد کئے جائیں گے۔ ہم نہیں ہوں گے لیکن اگر ہماری روحیں آپ کی کامیابیوں سے واقف ہو سکیں گی تو بڑی راحت پائیں گی اور مرحبا اور صلّ علیٰ کے پھول برسائیں گی۔ آپ اٹھیں اور اپنے فرائض ادا کرنے میں مشغول ہو جائیں کہ وقت نہایت قیمتی ہے اور تھوڑا۔ راہِ دل بڑی کٹھن ہے اور نہایت دراز۔ منزل دور ہے اور بہت دور۔

اب میں کالج کے واجب الاحترام اساتذہ اور معظمی و محترمی حضرت صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں اس تعلیمی سال کے خوبی و خوش اسلوبی اور کامیابی سے ختم ہونے پر گوناگوں دعاؤں کے جھرمٹ میں ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہ سال بیش از بیش کامیابیوں کا سال تھا، تعلیمی و تنظیمی لحاظ سے بھی اور کھیل کے لحاظ سے بھی۔ جہاں اور کالجوں میں افراتفری ہنگامہ آرائی۔ پریشان خاطری اور انتشار پسندی کی کھلے بندوں نمائش کی گئی وہاں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تعلیم الاسلام کالج کے محترم اساتذہ اور عزیز طلباء نے صحیح اسلامی تعلیم کا نمونہ دکھایا اور حسبِ سابق فساد فی الارض اور اسی قسم کے دوسرے تمام غیر اسلامی طور و طریق کار سے عملی نفرت و حقارت کا اظہار کر دیا فجزاھم اللّٰہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ اور یہ نتیجہ ہے تعلیم الاسلام کالج سے وابستگی و شیفتگی کا۔ چونکہ پچھلا تجربہ بتا رہا ہے کہ آنیوالے دنوں میں بھی خطرات پیش آنے کا احتمال ہے اس لئے عزیز طلباء و محترم اساتذہ کو بہت ہوشیار اور خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم الاسلام کالج کے طلباء جب تک تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کا اہم کام تحصیلِ علم اور واقفیتِ اسلام ہے۔ سیاست ان کے لئے سمّ قاتل۔ تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد ضرورت اور تقاضائے وقت سے جائز سیاسی یا مفید غیر سیاسی مشاغل میں حصہ لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

تعلیم الاسلام کالج کی جو تعلیمی و تنظیمی ترقیاں ہم سب کے لئے موجبِ مسرت و انبساط ہوئی ہیں ان میں سے ایک ہمارے عزیز القدر طلباء کے کھیل کی ترقی بھی ہے کیونکہ اس سال انہوں نے اکثر کھیلوں میں کوئی نہ کوئی پوزیشن ضرور حاصل کی ہے الحمد للہ۔ کھیل نہ صرف صحتِ جسمانی کے لئے ایک ضروری وظیفے کا حکم رکھتے ہیں بلکہ ذہنی و اخلاقی صحت کے بھی معاون و مددگار بنتے

ہیں اور بیرونی دنیا سے بے تکلف و خوشگوار تعلقات کے قیام کا باعث اور تبلیغ کے لئے نئی نئی راہیں کھل جانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اِس لحاظ سے کھیلنا بھی ایک نیکی ہے بشرطیکہ نیت بھی نیک ہو۔ مَیں بڑی مسرّت سے تمام کھیلنے والوں (کھلاڑیوں) کو مبارکباد کہتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تعلیم الاسلام کالج کا پرچم ہر مقابلے اور ہر میدان میں بلند و بالا رکھے اور فاستبقوا الخیرات کی روح ہمیشہ آپ میں زندہ و قائم رہے۔ مَیں محترم اساتذہ کے لئے بھی دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے خاص فضل و رحمت سے نوازے اور اپنی خاص تائید سے تمام فرائض کو صحیح معنوں میں انجام دینے کی توفیق بخشے۔ مَیں تحصیلِ علم سے فارغ ہو کر جانیوالے طلباء اور موجودہ و سابقہ طلباء اور آنیوالے طلباء کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں حسناتِ دارین سے سرفراز فرمائے اور دین و دنیا میں سرخروئی بخشے اور حقیقی معنوں میں تعلیم الاسلام کالج کا شایانِ طالبعلم بنائے۔ انہیں ہر قسم کے شر سے محفوظ رکھے اور ان تمام وعدوں کا جو اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے بارے میں ہیں وارث بنائے آمین یا ارحم الراحمین آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین

زمین و آسمان کا نُور

"اللہ تعالیٰ آسمانوں کا بھی نور ہے اور زمین کا بھی۔ اس کے نور کی کیفیت یہ ہے کہ جیسے ایک طاق ہو جس میں ایک دِیا پڑا ہو اور وہ دِیا ایک شیشے کے گلوب کے نیچے ہو اور وہ گلوب ایسا چمکدار ہو گویا وہ ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے اور وہ چراغ ایک ایسے برکت والے درخت کے تیل سے جلایا جا رہا ہو کہ وہ درخت نہ مشرقی ہو نہ مغربی۔ قریب ہے کہ اس کا تیل خواہ اُسے آگ نہ بھی چھوئی ہو بھڑک اُٹھے۔ یہ چراغ بہت سے نوروں کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نُور کے لئے جن کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے تمام ضروری باتیں بیان کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک چیز کو خوب جانتا ہے۔" (سورۃ النّور)

لطف الرحمٰن محمود

اُردو شاعری کا زرّیں دَور

(پہلی قسط)

کہا جاتا ہے کہ ہر زبان کے ادب کا آغاز شاعری سے ہوا ہے۔ یہی حال دوسری زبانوں کی طرح اُردو کا بھی ہے کسی زبان کے متعلق ہم قطعی طور پہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس سال، کس دن اور کس وقت معرضِ وجود میں آئی۔ زبان کی پیدائش کسی بچّے کی پیدائش سے مختلف ہے۔ خاص حالات میں مختلف زبانوں کے باہمی ملاپ سے نئی زبان جنم لیتی ہے اور یہ عمل بسا اوقات سو سو دو دو سو سال تک جاری و ساری رہتا ہے۔ زبان کے ظہور کے بعد اس کے ارتقا کا مرحلہ آتا ہے جس طرح آنِ واحد میں زبان کا ظہور نہیں ہوتا اسی طرح کسی ٹونے ٹوٹکے سے یا پھونک مار کر زبان کو فوراً انتہائی ترقی یافتہ حالت میں بھی نہیں پہنچایا جا سکتا۔ زبان موافق اور مناسب حالات کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ ارتقائی مدارج طے کرتی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ کسی خاص دَور میں بعض وجوہ کی بنا پہ زبان کے ارتقا کا عمل زیادہ نمایاں، واضح اور مؤثر صورت اختیار کر جائے۔ یہ صورتِ حال کم و بیش ہر زبان کی تاریخ ارتقا میں ہمیں نظر آتی ہے۔ اُردو شاعری کی تاریخ میں یہ کیفیت میر۔ سودا اور درد کے زمانہ میں پیدا ہوئی۔ اسی وجہ سے اردو ادب میں میر اور سودا کے دَور کو اردو شاعری کا زرّیں دَور قرار دیا جاتا ہے۔ اس دَور میں اُردو شاعری کی مختلف اصناف مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی اور صوفیانہ شاعری نے ترقی کی۔ اسی دَور میں مرثیہ نے ایک ایسی شکل اختیار کی جس پہ آنے والوں نے رفیع الشان قصر تعمیر کیا۔ مروجہ اصنافِ سخن کی ترقی کے علاوہ شعراء نے بعض نئے تجربے کئے۔ نئی اصناف کا ظہور ہوا۔ نئی بحریں شاعری میں داخل ہوئیں صنعت ایہام کی وجہ سے شاعری کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ اس دَور میں کھُل کر اس انداز کی مخالفت بلکہ مذمت کی گئی۔ پھر اسی دَور میں الفاظ کی تذکیر و تانیث پر بھی پابندی عائد کی گئی جس کی وجہ سے زبان میں کچھ توازن پیدا ہوا۔ اسی دَور میں زبان کو وسعت نصیب ہوئی۔ فارسی محاورات کا ترجمہ ہوا۔ فارسی تراکیب کو بکثرت استعمال کیا جانے لگا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ زبان کی صفائی کی طرف بھی توجہ کی گئی۔ پھر اسی دَور میں لکھنو مذاقِ شعر سے آشنا ہوا جو بعد میں خود زبانِ اردو کا ایک الگ سکول بن گیا جس سے اُردو شاعری میں لکھنویت کی تحریک چلی جس کے بعض تاریک پہلو نظر انداز نہیں کئے جا سکتے مگر مرثیہ کے میدان میں اسی لکھنؤ نے آگے

چل کہ اردو شاعری کو ایک عظیم الشان شعری سرمایہ فراہم کیا۔ پھر اسی دور میں اُردو شعراء کے حالات اور کلام پر مشتمل تذکرہ لکھ کر تذکرہ نگاری کا آغاز کیا گیا۔ ان مختلف وجوہ کی بنا پر اس دور کو اُردو شاعری کا زریں دور قرار دیا جاتا ہے۔ ان تمام پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ تو کتابی شکل اختیار کر سکتا ہے یہاں اختصار کے ساتھ ہلکے ہلکے اشارے ہی ممکن اور مناسب ہیں۔

۱۔ مختلف اصناف کی ترقی

۱۔ غزل کی ترقی۔ اُردو غزل کی ابتداء اگرچہ ولی دکنی سے پہلے ہو چکی تھی مگر متفقہ طور پر ولی کو غزل کا اوّلین معمار سمجھا جاتا ہے۔ ولی سے پہلے غزل معیاری نہ تھی۔ زبان کی عدم صلاحیت اہلِ دکن کے مزاج کی مثنوی سے فطری ہم آہنگی۔ اور پھر شاعری کے مرکز دہلی سے دُوری کی وجہ سے غزل معیاری نہ ہو سکی۔ ولی نے سعد اللہ گلشن کے مشورہ سے غزل کی دنیا میں انقلاب برپا کیا۔ اس انقلاب کے نتیجے میں ایک حد تک ہیئت (FORM) وحدتِ تاثر اور تغزل کے مختلف عناصر مثلاً توازن۔ ایمائیت اور لطیف ابہام وغیرہ غزل میں شامل ہو گئے۔ ولی کا رنگ ہی اہلِ دہلی نے اختیار کیا لیکن اسے ترقی میر نے دی۔ میر کی غزل بعض خصوصیات کی وجہ سے آج بھی ممتاز ہے۔ اور آج کا شاعر میر کی بعض لحاظ سے تقلید کر رہا ہے اسی وجہ سے میر کو "شاعرِ عام" قرار دیا گیا ہے۔ آج کا قاری میر کے کلام کے اکثر حصے میں اپنے دل کی دھڑکنیں محسوس کرتا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب میر کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"میر اُردو غزل کے خدا ہیں۔ اُن کے کلام کے نمایاں جوہر جذبہ کی شدّت بیان کی سادگی اور شروع سے آخر تک سوز و گداز کی کے ہے۔" (غزل اور متغزلین ص ۲۰۱)

ڈاکٹر اعجاز حسین بٹالوی میر کے متعلق لکھتے ہیں :۔

"اُن کے اشعار میں سادگی اور صفائی اتنی زیادہ ہے کہ بلا غور و فکر اشعار ذہن میں سما جاتے ہیں اور دل میں نشتر کی طرح اُتر جاتے ہیں۔" (مختصر تاریخ ادب اردو ص ۹۰-۹۱)

اس کے علاوہ اکثر نقادوں اور پھر اُن کے بعد آنیوالے شعراء غالب۔ ناسخ۔ ذوق۔ حالی اور حسرت موہانی وغیرہ نے اپنے اشعار میں میر کے "شیوۂ گفتار" اور "انداز" کو اپنانے کی حسرت ظاہر کی ہے مگر حقیقت وہی ہے جو ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم نے بیان کی ہے :۔

"میر غزل گو شاعر تھے۔ اور آج تک کوئی بھی باوجود سخت کوششوں کے اِس صنفِ سخن میں اُن کا کامل ہمسر نہ ہو سکا۔"

میر کا غم، ان کی دردمندی، ہمدردی، خاص قسم کی یاسیّت اور بے ضرر طبیعت نے ان کی شاعری پر خاص

اثر ڈالا ہے۔ الم پسندی کے ساتھ ایک خاص دُکھ بھرا لہجہ ہے ؎

ہمارے آگے جب تیرا کسو نے نام لیا ✤ دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
جب نام تیرا لیجئے تب چشم بھر آوے ✤ اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے
کوئی کانٹا سرِ راہ کا ہماری خاک پر بس ہے ✤ گل و گلزار کیا درکار ہے گورِ غریباں کو

اُن کے زمانے میں دلّی اُجڑی اُس کی تصویریں اُن کی غزل میں علائم و رموز کی شکل میں آج تک موجود ہیں ؎

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک ✤ اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہو چراغ ایک
دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے ✤ یہ نگر سو مرتبہ لُوٹا گیا

میرؔ کی غزل میں زندگی کی تلخ صدائیں چیخ رہی ہیں۔ نیچر۔ آدمیت اور سرمایہ کے متعلق ایک خاص انداز نظر ہے۔ غزل کو مظاہراتی اسلوب (Demonstration) سے روشناس کرانیوالے میرؔ ہی ہیں ؎

آوارگانِ عشق کا پوچھا جو میں نشاں ✤ مشتِ غبار لے کے صبا نے اُڑا دیا

اس کے علاوہ غزل کو فارسیت۔ عاشقانہ کلچر۔ ایجاز۔ موسیقت اور بحروں کے خصوصی ترنّم سے میرؔ ہی نے آشنا کیا۔ میرؔ نے غزل کو بہت کچھ دیا ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی غزل آج تک زندہ ہے اور ابھی مزید زندہ رہے گی۔ خود میرؔ نے بھی کہا ہے ؎

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدتوں رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

ب۔ قصیدہ کی ترقی۔ اِس دَور میں قصیدہ نے بھی بڑی ترقی کی ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہے کہ قصیدہ اپنی معراج کو پہنچا۔ سوداؔ جنہیں قصیدے کا بادشاہ قرار دیا جاتا ہے اسی دَور کے رکن رکین ہیں بلکہ انہیں مسلّمہ طور پر اُردو کا سب سے بڑا قصیدہ نگار گردانا جاتا ہے۔ قصیدہ بھی اُردو شاعری کو فارسی سے ملا ہے۔ عربی قصائد فارسی قصائد سے ایک لحاظ سے افضل ہیں۔ کیونکہ عربوں کی خودداری اور خودشناسی کے احساس سے ایرانی شعراء عاری معلوم ہوتے ہیں۔ پھر اُردو شاعری کو وہ مناسب ماحول میسّر نہیں آسکا جو قصیدے کو راس آتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں قصیدے نے جنم لیا۔ خواصی، شاہیؔ، نصرتیؔ کے قصائد موجود ہیں۔ ان میں زورِ بیان اور شوکتِ الفاظ بھی ہے مگر زبان ابتدائی دَور سے گذر رہی تھی۔ قصیدے کے لئے تو ترقی یافتہ زبان کی ضرورت تھی۔ یہ فخر بھی سوداؔ کو حاصل ہے کہ انہوں نے قصیدے کے تنِ مُردہ میں نئی جان ڈالی۔ یہ کہنا غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ سوداؔ نے اُردو قصیدے کو فارسی قصیدے کے دوش بدوش کھڑا کرنے کی پوری کوشش کی اور اس میں انہیں اچھی خاصی کامیابی بھی ہوئی بلکہ سوداؔ نے قصیدہ کو فارسی والوں سے بھی آگے لے جانے کی

کوشش کی ہے۔ محمد حسین آزاد نے سوداؔ کے قصائد کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"وہ اس میدان میں فارسی کے نامی شاہسواروں کے ساتھ عناں در عناں ہی نہیں گئے بلکہ اکثر میدانوں میں آگے نکل گئے۔ اُن کے کلام کا زور شور انوریؔ اور خاقانیؔ کو دباتا ہے اور نزاکتِ مضمون میں عرفیؔ اور ظہوری کو شرماتا ہے۔"
(آبِ حیات ص ۱۵۲)

قصیدہ تشبیب۔ گریز۔ مدح۔ طلب اور دعا کئی اجزائے ترکیبی کا مجموعہ ہے۔ سوداؔ نے ان اجزا میں بھی جدت پیدا کی۔ بعض اوقات تشبیب در تشبیب اور گریز در گریز کو اختیار کیا۔ ایسے قصائد میں سے اگر ایک تشبیب نکال لی جائے پھر بھی قصیدہ مکمل ہی رہتا ہے۔ سوداؔ کا ایک قصیدہ تشبیب سے شروع ہوتا ہے اور تشبیب پر ہی ختم ہوتا ہے۔ سوداؔ کی بہاریہ تشبیب کے متعلق انتہا پسند نقاد کلیم الدین احمد نے تسلیم کیا ہے کہ ان تشبیبوں کے ٹکڑے علیحدہ کر کے دیکھے جائیں تو مختلف مناظر کی دلکش تصاویر بن جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی تشبیب میں تضاد کا پہلو بھی آ جاتا ہے مگر ان کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدح کے حصے کو کم سے کم کرنے کے لئے ان اجزا کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ تشبیب در تشبیب کی طرح گریز در گریز پر بھی قادر ہیں - - - - - - -
"اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل" والے قصیدے سے ایک مثال ملاحظہ ہو ؎

تا کجا شرح کروں میں کہ بقولِ شاعر ✦ انگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

سوداؔ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے مربیوں کے علاوہ بزرگانِ امت کی مدح میں بھی قصیدے لکھے۔ مثلاً

۱۔ "قصیدہ در نعت حضرت سید المرسلین خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم"

۲۔ "قصیدہ در منقبت امیر المومنین اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب صلوٰۃ اللہ تعالیٰ علیہ"

غرض ہر جہت سے سوداؔ نے قصیدے کو ترقی دی۔ بعض نقادوں نے تو اس پر اتفاق کیا ہے کہ قصیدہ سوداؔ سے شروع ہوا اور اسی پر ختم ہو گیا ـــــ کیونکہ ان کے بعد ذوقؔ۔ غالبؔ۔ مومنؔ۔ امیرؔ۔ داغؔ اور جلالؔ وغیرہ ہی ذرا نمایاں قصیدہ گو ہیں۔ غالب اپنی جدت کی وجہ سے کچھ ممتاز ہیں مگر سوداؔ کی فوقیت ان سب پر مسلّم ہے۔

ج۔ صوفیانہ شاعری کی ترقی۔ اُردو کو پالنے پوسنے میں حضرات صوفیائے کرام کا بڑا دخل ہے۔ ڈاکٹر عبد الحق مرحوم نے ان کی خدمات کا جائزہ لیا ہے اُردو غزل میں صوفیانہ خیالات کو نظم کرنے کی روایت ابتداء سے چلی آئی ہے۔ مگر اس دور میں میر دردؔ نے جس انداز سے تصوف کو غزل میں سمویا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ صوفیانہ خیالات کو نظم کرنا تو کوئی بڑا معرکہ نہیں اصل کام تو یہ ہے کہ تصوف کو اس طرح نظم کیا جائے کہ شعریت مجروح نہ ہو اور شاعری کے جملہ تقاضے بطریق احسن پورے ہوں۔ صوفی شعراء کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے عقاید اور

نظریات کو شعریت پر مقدم کیا ہے مگر درد نے تصوف کے بوجھ تلے شعریت کو دب کر مرنے سے بچایا۔ نقادوں کی اس رائے میں مبالغہ نہیں کہ درد کی شاعری نے تصوف کو اور تصوف نے شاعری کو اونچا کیا ہے۔ مولانا آزاد۔ عبدالسلام ندوی اور عظمت اللہ خان نے درد کو اُردو شاعری میں تصوف کا "باوا آدم" قرار دے دیا۔ اگرچہ یہ غلط ہے کیونکہ تصوف کہنے والے درد سے پہلے بھی موجود رہے ہیں اور ان کا متصوفانہ کلام ہمارے سامنے موجود ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں ان کا کوئی ہمسر آج تک پیدا نہیں ہو سکا۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

دل بھی تیرے ہی ڈھنگ سیکھا ہے + آن میں کچھ ہے آن میں کچھ ہے
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر + جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے
مت عبادت پہ پھولیو زاہد + سب طفیلِ گناہِ آدمؑ ہے
کرے ہے کچھ سے کچھ تاثیر صحبت صاف لوگوں کی + ہوئی آتش سے گل پہ بیٹھتے رقصِ شرر شبنم

جہاں "مجازی محبت" کے مضامین باندھے ہیں وہاں بھی جدت اور پاکیزگی کے عناصر موجود ہیں ؎

میں سامنے سے جو ٹک کر آیا + ہو ٹک اس کا بھی درد دل گیا تھا
میرے ہونے پہ عبث اُکتے ہو + پھر اکیلے بھی تو گھبرائیے گا
اپنے ملنے سے منع مت کر + اس میں بے اختیار ہیں ہم لوگ

اگر کہیں واعظِ خراب حال پر طنز کی ہے تو وہاں بھی حسن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ؎

ہماری اتنی ہی تقصیر ہے کہ اے زاہد + جو کچھ ہے دل میں ترے ہم وہ قائل نکلتے ہیں

ڈاکٹر اعجاز حسین نے درد کے متعلق لکھا ہے:۔

"اکثر دقیق مسائل کو نہایت مزے اور اختصار کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔"

(مختصر تاریخِ ادبِ اردو ص۸۵ تفصیل: آئینہ معرفت از اعجاز)

مولانا آزاد نے اسی بنا پر درد کو اُردو شاعری کے "ارکانِ اربعہ" میں شامل کرتے ہوئے کہا ہے کہ تصوف جیسا انہوں نے کہا اُردو میں آج تک ایسا کسی سے نہیں ہوا۔" (آبِ حیات ص۱۸۵)

د۔ مرثیہ کی ترقی۔ میر انیس اور مرزا دبیر کو مرثیہ گوئی میں جو مقام حاصل ہے وہ اُردو ادب کے طلبہ کی نظر سے اوجھل نہیں۔ ان اصحاب نے مرثیہ کو بڑی ترقی دی ہے اور تصویر کشی۔ محاکات۔ منظر نگاری۔ جذبات نگاری اور انسانی نفسیات کے مظاہر کی عکاسی کرنے میں حیران کن ذہانت کا مظاہرہ کیا ہے۔

اُردو شاعری میں مرثیے کا آغاز دکن میں ہوا کیونکہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے فرمانروا شیعہ مذہب کے پیروکار تھے۔

اس لئے مرثیہ نگاری وہاں ایک مذہبی فریضہ کی شکل میں نمودار ہوئی پھر مغلوں کے حملوں سے آخر کار یہ سلطنت برباد ہوئی تو شعراء نے اپنے غم کو ہلکا کرنے کے لئے مرثیہ خوانی پر زور دیا۔ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے جس کا ظہور ۱۸۵۶ء کے اُجڑے ہوئے لکھنؤ میں بھی ہمیں ملتا ہے جب امام باڑے جنگ کا مرکز بن گئے اور جہاں مرثیہ اپنے انتہائی مقام کو پہنچا۔ بہرحال مذہبی اور سیاسی اثرات کی وجہ سے سرزمین دکن مرثیہ نگاری کے لئے بڑی سازگار ثابت ہوئی لیکن ابتدائی دور میں مرثیہ کی نوعیت ایک بین کی سی تھی۔ بکائیہ بیانات کی کثرت ہوتی تھی۔ دوسرے فنی عناصر کی طرف بھی توجہ نہ کی جاتی تھی۔ ان فنی خامیوں کی کثرت کی بناء پر بگڑے ہوئے شاعر کو "مرثیہ گو" کہا جانے لگا۔ دکن کی ابتدائی حالت سے لکھنؤ کی انتہائی حالت تک پہنچنے میں مرثیہ کو سوداؔ کا زیر بار احسان ہونا پڑا۔ سوداؔ نے پہلی مرتبہ منظم رنگ میں مرثیہ کو غلطیوں سے پاک کرنے کی مہم چلائی۔ سوداؔ ہی نے سب سے پہلے مرثیے کو اس کی مقبول عام شکل یعنی مخمس میں لکھا۔ اگرچہ یہ متنازعہ فیہ مسئلہ کہ سب سے پہلے مخمس قصیدہ سوداؔ نے لکھا یا نہیں۔ لیکن یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ اسی دور میں مرثیہ مخمس کی شکل میں لکھا جانے لگا۔ میر تقی میرؔ اور افسردہؔ نے بھی مخمس کی شکل میں مرثیے لکھے۔ سوداؔ سے پہلے عموماً مرثیہ چومصرعہ ہوا کرتا تھا۔ بعد میں میر ضمیرؔ نے چہرہ سراپا رخصت۔ آمد۔ رجز۔ جنگ۔ شہادت وغیرہ عناصر کا اضافہ کیا۔ پھر میر خلیق۔ میر انیس وغیرہ نے اس صنف کو معراج کمال تک پہنچا دیا لیکن سوداؔ کے اصلاحی قدم کی اہمیت بہرحال مقدم اور مسلّم ہے۔

۴۔ مثنوی کی ترقی۔ مثنوی "افسانۂ منظوم" کو کہتے ہیں۔ یہ چیز بھی اُردو شاعری کو فارسی شاعری سے ملی۔ اُردو شاعری کا دامن ابتدا سے اس صنف سے بھرپور رہا ہے۔ سرزمین دکن کو ذہنی لحاظ سے مثنوی سے خاص نسبت بلکہ وابستگی رہی ہے۔ چنانچہ ہر قسم کی بے شمار مثنویاں مل جاتی ہیں۔ نظامی۔ فیروز۔ محمود۔ وجہی۔ رستمی۔ ابن نشاطی وغیرہ اُردو کے مثنوی گو ہیں لیکن میر سوداؔ کے دور میں میر حسنؔ نے "سحر البیان" لکھ کر اُردو مثنوی کو انتہائی نقطے پہنچا دیا۔ تذکرہ نگاروں نقادوں اور معاصروں نے بھی دل کھول کر ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ قتیلؔ۔ ماہرؔ اور مصحفیؔ نے اپنے اشعار میں تعریف کی ہے۔ مصحفیؔ نے تو سحر البیان کو "بتخانۂ چین" قرار دیا ہے۔

مثنوی لکھنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس کی کئی اقسام ہیں۔ حکیمہ۔ صوفیانہ۔ بزمیہ اور رزمیہ مشہور ہیں۔ سحر البیان "بزمیہ مثنوی" کی مثال ہے۔ رزمی اور بزمی مثنوی میں اصل چیز "ربط کلام" ہے۔ زنجیر کے حلقوں کی طرح شعر آپس میں مربوط ہونے چاہئیں۔ میر حسن کو اس میں حیران کن حد تک کامیابی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے بقول ان خصوصیات سے ——

"سحر البیان کے سوا اُردو کی کسی اور مثنوی میں عہدہ برآ ہونے کی کم کوشش کی گئی ہے"!

پھر مثنوی کو اس طرح بندش کے اعتبار سے سُلجھا ہوا ہونا چاہیئے کہ ڈرامے کی سی کیفیت پیدا ہو جائے۔ اس میں بھی میر حسن کو کامیابی ہوئی ہے۔ اختصار۔ منظر نگاری۔ جذبات نگاری۔ کردار نگاری اور مکالمہ نگاری میں سحر البیان ایک مثالی مثنوی

ہے۔ اس کے علاوہ یہ مثنوی اپنے عہد کی ترجمان اور عکاس ہے۔ زمانے کی رسوم۔ رواج۔ عقائد۔ عادات اور طرزِ بود و باش کو اشعار میں محفوظ کر دیا ہے۔ زبان کی خوبیوں کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس مثنوی کے بعض اشعار اور مصرعے ضرب الامثال بن کر زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ مثلاً ؎

"سدا عیش دَوراں دکھاتا نہیں + گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"
"کسی کی بدی تو نہ کر عیب ہے + کہ اس کا خدا عالم الغیب ہے"
ع "جوانی کی راتیں مرادوں کے دن"
ع "جو وہ مہرباں ہوں تو کل مہرباں"

س۔ ہجو کی ترقی۔ جس طرح قصیدے کو سودا نے بامِ عروج پہ پہنچایا اسی طرح انہوں نے "ہجو" کو بھی عظمت عطا کی۔ ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں :-

"غالباً مرزا سودا پہلے شخص ہیں جنہوں نے ہجو کو اس قدر رشد و مد کے ساتھ اُردو میں نظم کیا۔"

سودا ہجو میں کہیں کہیں بہت سخت بھی ہو گئے ہیں۔ مثلاً فدوی پنجابی کی جس طرح انہوں نے خبر لی ہے خدا ہر انسان کو اس سے بچائے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی ہجویات ذاتیات کے دلدل سے باہر نہیں آ سکیں۔ سودا کی ہجویات کا پایہ بڑا بلند ہے۔ انہوں نے ہجویات میں زمانے کے تنزل کی تصویر کشی کی ہے۔ شرفاء اور امراء کی کیفیات کا تجزیہ کیا ہے دہلی کی زندگی کی خوب عکاسی کی ہے۔ ان کی ہجویات میں پاکیزہ اور شائستہ تمسخر اور مذاق کا مواد بھی خاصہ موجود ہے قصیدے کے الفاظ پر جو تصرف انہیں حاصل ہے وہ ہاجی میں بھی بدستور قائم رہتا ہے۔ انہی وجوہ کی بناء پر سکسینہ صاحب کا خیال ہے کہ سودا نے ایک متبذل صنعت کو بھی باقاعدہ فن بنا دیا۔ ان کا یہ قول بجا ہے کہ مرزا کے اس کلام میں جوونیال والٹیر اور سویفٹ تینوں کا مزا ہے۔ مرزا کے زمانے کی دہلوی معاشرت کی فنکارانہ عکاسی کی وجہ سے سودا کی ہجویات ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ سکسینہ صاحب نے ایک انگریز نقاد کا قول سودا کی ہجویات کے متعلق درج کیا ہے :-

"جس طرح روما اگسٹس کے زوال کی تصویروں کے واسطے ہم جوونیال ایسے مرقع نگاروں کی صفحہ گردانی کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم کو اگر زوالِ دولتِ مغلیہ کی سچی تصویریں دیکھنا ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ سودا کی ان پُر آشوب نظموں کا مطالعہ کریں جن میں انہوں نے مرہٹہ سواروں کی عین قلعہ دہلی کی دیواروں کے نیچے قتل و غارت گری کا سچا فوٹو اتارا ہے ــــــ"

(ہسٹری آف اُردو لٹریچر ترجمہ عسکری ۱۳۵ھ، ص۱۴۷)

۲۔ نئی اصناف کا ظہور

میرؔ و سوداؔ کے دَور میں مروّجہ اصنافِ سخن کی ترقی کا اندازہ اوپر کی مختصر سی بحث سے ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ ہجو وغیرہ انتہائی بلند مقام تک جا پہنچے بلکہ بعض شعرا کے ساتھ یہ اصناف وابستہ ہو کر رہ گئیں جو اس فن کے امام اور بادشاہ قرار دیئے گئے جیسے غزل میں میرؔ، قصیدے اور ہجو میں سوداؔ۔ تصوّف میں دردؔ اور مثنوی میں میر حسن، لیکن اس لحاظ سے بھی اس دَور کو خصوصیّت حاصل ہے کہ اس میں بعض نئے تجربے ہوئے۔ متعدد نئی بحریں شاعری میں داخل کی گئیں۔ اس کے علاوہ میرؔ صاحب نے اُردو شاعری کو "واسوخت" عطا کیا۔ سکسینہ صاحب نے لکھا ہے کہ اُردو شاعری کو مثلث اور مربع منظومات بھی جنابِ میر نے ہی عطا کی ہیں۔ (تاریخ ادب اُردو ص ۱۹۲) لیکن ولیؔ دکنی کے ہاں بھی اسی قسم کی چیزیں "ثلاثی" اور "چار در چار" کی شکل میں موجود ہیں۔ ولیؔ کی ایک مشہور ثلاثی کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

پیو! رقیباں پہ نت کرم مت کر ✣ رات دن مجھ اُپر ستم مت کر

بات ہے دُور یہ زراہِ وفا

لیکن میرؔ صاحب نے اسے بھی ترقی دی ہے۔ اپنی مثلث منظومات کے علاوہ اُنہوں نے بعض فارسی اشعار کی تضمین کر کے انہیں مثلث اور مربع شکل میں پیش کیا ہے۔ ان کی ایسی منظومات بھی بہت دلکش ہیں بلکہ تکمیلِ معانی کے لحاظ سے اصل اشعار کے لطف میں بھی اضافہ کر دیتی ہیں۔ مثلاً اس شعر کو مثلث کیا ہے ؎

امروز یقین شُد کہ نہ داری سرِ اہلی ✣ بیچارہ زلُطفِ تو غلط داشت گمانہا

میر تقی میرؔ ؎

کل تک تو فریبندہ ملاقات تھی پہلی ✣ امروز یقین شُد کہ نہ داری سرِ اہلی

بیچارہ زلطف تو غلط داشت گمانہا

لیکن "واسوخت" یقینی طور پر اُردو شاعری کو جنابِ میرؔ کا عطیہ ہے۔ (فارسی میں فغانی یا وحشی کو اس صنف کا بانی قرار دیا جاتا ہے) "واسوخت" میں عاشق اپنے محبوب کی بے نیازی اور بے وفائی سے تنگ آ کر کسی نئے محبوب سے اُلفت کی پینگیں بڑھانے کی دھمکیاں دیتا ہے۔ بسا اوقات نئے محبوب سے تعلقاتِ محبّت استوار کر کے ان کا تذکرہ پہلے محبوب کو جلانے کے لئے اس کے سامنے کرتا ہے۔ اس کارروائی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پہلا محبوب پہلے کی طرح اُس کی طرف مائل ہو جائے۔

میرؔ کے دو واسوخت ہیں جو بہت مشہور ہیں۔ محمد حسین آزاد کی رائے میں "لاجواب ہیں" (آبِ حیات ص ۲۰۶) اس کے بعد اُردو میں متعدد شعراء نے واسوخت لکھے۔ جرأت کے واسوخت بھی کافی مشہور ہیں مگر ان میں ابتذال،

عریانی اور رکاکت کا پہلو بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔

۳۔ ایہام گوئی کی مذمّت

جنوبی ہندوستان میں ایہام گوئی کی تحریک نے اُردو شاعری میں زور پکڑ لیا تھا۔ یہ تحریک متعدد سیاسی۔ سماجی اور ادبی اسباب کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئی۔ ولی دکنی کی دہلی میں آمد سے قبل یہ تحریک زوروں پر تھی۔ عالمؔ۔ آبروؔ۔ ناجیؔ اور مضمونؔ وغیرہ اس کے بڑے مبلّغ تھے۔ ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے لکھا ہے کہ یہ غیر صحت مندانہ تحریک ہندی کے دوہروں سے اُردو میں آئی۔ رام بابو سکسینہ نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ یہ بھاشا میں بہت مقبول ہے اور دوہروں کی جان سمجھی جاتی ہے۔ یہ "محمد شاہی دَور" کی خصوصیّت سمجھی جاتی ہے۔ اس تحریک کے زیرِ اثر سیدھی سادھی بات کو ذو معنی بنا دیا جاتا بے تکلّفی اور سادگی پر تکلف اور تصنع کو ترجیح دی جاتی، اسی کشمکش میں سوداؔ اور اثرؔ جو شاعری کی جان اور روح ہیں زائل ہو جاتے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

۱۔ آبروؔ ؎ کنجی، اس کی زبانِ شیریں ہے
دل مرا قفل ہے بتاشے کا

(ایک چھوٹا سا قُفل جو بتاشے جیسا ہوتا تھا اس سے دل کو تشبیہ دی ہے)

۲۔ ناجیؔ ؎ اُس کے رُخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے

(عارضی = (i) جس کا دار و مدار، عارض یعنی چہرہ پر ہو۔ (ii) ناقیام پذیر)

۳۔ محمد احسن احسنؔ = لام تعلیق ہے اُس بُتِ خوش خط کی زُلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اس لام کے

("اس لام" = اِسلام)

احسنؔ : یہی مضمونِ خط ہے احسن اللہ
کہ حُسن خوبرویاں عارضی ہے

اسی غیر صحت مند تحریک کی سوداؔ۔ میرؔ۔ قائمؔ اور مرزا مظہر جانِ جاناں نے مذمّت کی۔

میرؔ ؎

کیا جانے دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

سوداؔ ؎
یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

قائمؔ ؎
بطور ہزل ہے قائمؔ یہ گفتگو ورنہ
تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

مرزا مظہر جان جاناں نے بڑی شدّت سے ایہام گوئی کی مذمّت کی بلکہ وہ اس تحریک تجدید کے بانی تھے۔
مولانا عبدالسلام ندوی نے لکھا ہے:-

"محمد شاہی دَور تک شاعری کا جو اندازہ تھا وہ بہت کچھ ترمیم و اصلاح کا محتاج تھا۔ اس لئے اس دَور کے بعد جب شاہ عالم کا زمانہ آیا۔ اور خواجہ میرؔ۔ دردؔ۔ فقیر دہلوی۔ مرزا سوداؔ۔ میر تقی اور میر حسن اور مرزا مظہر جان جاناں جیسے مصلحینِ فن پیدا ہوئے تو سب سے پہلے مرزا مظہر جان جاناں نے اس طرف توجہ کی اور ایک مستقل تجدید و اصلاح کی بنیاد ڈالی۔"

(شعر الہند جلد اوّل ص۳۳)

مصحفی اور شوقؔ نے اپنے تذکروں میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ رام بابو سکسینہ نے اظہار افسوس کیا ہے کہ مظہر جان جاناں کی ان گرانقدر خدمات کا اس طرح اعتراف نہیں کیا گیا جیسا کہ ان کا حق تھا۔ بہرکیف ایہام گوئی کی مذمّت اور اس عنز تحریک کا انسداد اس دَور کی ایک خصوصیت ہے۔ (باقی)

آئندہ قسط میں ملاحظہ فرمائیے۔ اُردو شاعری کے زریں دَور میں ——

(۴) اُردو زبان کی وسعت اور ترقی
(۵) اُردو زبان کی قراش خراش
(۶) لکھنؤ پہ اس دَور کے شاعرانہ اثرات
(۷) تذکرہ نگاری کا آغاز

—— وغیرہ وغیرہ

(ادارہ)

عطاء المجیب راشد

سات قصیدے

جو خانۂ کعبہ کے پردوں سے لٹکائے گئے

عربی تہذیب و تمدن میں شاعری کو ایک اہم مقام حاصل ہے خاص طور پر زمانۂ جاہلیت میں تو شاعری ان کے معاشرہ کا ایک جزو لاینفک بن چکی تھی جس کے بغیر کسی باعزت تہذیب و معاشرت کا تصور ناممکن تھا۔ ہر قبیلہ کا ایک شاعر ہوا کرتا تھا جو قبیلہ کی تعریف میں قصائد کہتا قبیلہ کے نمایاں خصائل کا تذکرہ اپنی نظموں میں کرتا۔ اور اپنی قوم کی بہادری اور شجاعت کی داستانوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتا تھا۔ ان شعراء کو عرب اقوام بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ قوم کے شعراء کی فصاحت، لیاقت اور شاعری قوم کے لئے وجہ افتخار سمجھی جاتی تھی۔

عربوں کے ہاں میلوں کا رواج عام تھا۔ حجاز میں عکاظ۔ یمن میں صنعاء، بحرین میں منصف۔ قرب شام میں دومۃ الجندل اور عمان میں وبار کے مقامات ان میلوں کے لئے خاص شہرت کے حامل تھے۔ ان میلوں کے موقعہ پر تجارت کے علاوہ شعر بازی کے بھی مقابلے ہوتے۔ مختلف قبائل کے شعراء یہاں اکٹھے ہوتے اور اپنے اپنے قصائد پڑھ کر سناتے۔ جس قبیلہ کے شاعر کا کلام سب سے اعلیٰ تسلیم کیا جاتا اس کی قدر و منزلت بڑھ جاتی اور اس شاعر کو گرانقدر انعام و اکرام دیا جاتا۔ میلوں میں شرکت کرنے والے لوگ اس اعلیٰ کلام کو فوراً یاد کر لیتے اور سارا سال ملک میں اس کا چرچا جاری رہتا۔

ایک لمبے عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر اس کے بعد یہ دستور بن گیا کہ جو کوئی اعلیٰ شعر کہتا وہ مکہ میں آتا اور قریشِ مکہ کی مجلس میں اپنا کلام سناتا۔ اگر تو کلام واقعی بہت اعلیٰ اور بلند پایہ ہوتا تو سب اس کی تعریف کرتے اور خوب داد دیتے وگرنہ اس کے کلام کو ردی اور لغو قرار دیتے۔ پھر اس کے کچھ عرصہ بعد یہ رواج بن گیا کہ جس شاعر کا کلام سب سے اعلیٰ اور بلند مرتبہ قرار دیا جاتا اس کی قدردانی کے اظہار کے طور پر وہ کلام خانہ کعبہ کے پردوں سے لٹکا دیا جاتا تاکہ لوگ سارا سال ان قصائد کو پڑھتے رہیں۔ چنانچہ عملی طور پر یوں ہی ہوتا کہ عام مجالس کے علاوہ عرب لوگ جب سفر پر روانہ ہوتے تو تنہائی میں ان قصائد کو گا کر دل بہلاتے۔ کسی قصیدہ کا خانہ کعبہ کے پردوں سے لٹکایا جانا بہت بڑا اعزاز

سمجھا جاتا تھا۔ ایسے قصائد کو معلقات (لٹکائے جانیوالے قصائد) کا نام دیا گیا۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ ان قصائد کو سونے کے پانی سے لکھا جاتا تھا تاکہ ان کی بلند اور ارفع شان کا اظہار ہو سکے۔ سونے کی نسبت سے ان قصائد کو المذہبات کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اس قسم کے سات قصائد کو خاص اہمیت دی جاتی ہے جن کو سبع معلقات کہا جاتا ہے۔ بعض نے ان کی تعداد آٹھ اور دس تک بھی بتائی ہے تاہم زیادہ شہرت ابتدائی سات قصائد کو ہی حاصل ہے۔ ان قصائد کو "السبع" "السبع الطوال" اور "السموط" کے نام بھی دیئے گئے ہیں۔

اگرچہ جمہور علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہ وہ قصائد ہیں جن کو خانہ خدا کے پردوں سے لٹکایا گیا لیکن پھر بھی بعض علماء نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اگر ایک طرف ابن عبد ربہ نے کتاب العقد الفرید میں اور ابن رشیق صاحب کتاب العمدہ اور مشہور ادیب و مؤرخ ابن خلدون نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ان قصائد کو معلقات کا نام خانۂ خدا میں لٹکائے جانے کی وجہ سے دیا گیا تو دوسری طرف ابوجعفر النحاس النحوی نے ایسی تمام روایات کو محلّ نظر قرار دیا ہے۔ اس کا مؤقف یہ ہے کہ یہ تمام روایات محض ظنّی اور وضعی ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ حماد الراویۃ وہ پہلا شخص ہے جس نے ان قصائد کو جمع کیا اور عہد عباسیہ کے آغاز میں معلقات کا نام دیدیا دیگر بہت سے علماء اور محدثین اور خاص طور پر مستشرقین نے ابوجعفر کے اس خیال کی تائید کی ہے۔

اگر معلقات (لٹکائے جانے والے قصائد) کے لفظ سے جمہور علماء کے مؤقف کی تائید ہوتی ہے تو مخالف علماء اپنے حق میں مشہور مصنف لائل Lyall کا یہ قول پیش کر سکتے ہیں کہ:۔

"ان المعلقات مشتقۃ من العلق۔ وھو ما یضنّ بہ من الاشیاء والثیاب۔۔۔۔"

یعنی معلقات کا لفظ علق سے نکلا ہے جو زیورات، کپڑے اور اس جیسی دیگر اشیاء کے لئے بولا جاتا ہے جن کے متعلق بخل سے کام لیا جائے۔

اگر ہم ان اقوال و روایات سے بالاتر ہو کر اس امر پر غور کریں کہ اصل حقیقت کیا ہے تو ہمیں جمہور علماء کی تائید کرتے ہوئے اس امر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ عربوں نے ان قصائد کو ضرور خانۂ کعبہ کے پردوں سے لٹکایا ہوگا۔ اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں شعراء کو بہت بلند مقام حاصل ہوتا تھا یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے مرتبہ کو نبوت کے برابر قرار دیا جاتا تھا پس اس لحاظ سے عربوں کے ماحول کو مدّ نظر رکھتے ہوئے یہ کوئی ناممکن بات نظر نہیں آتی کہ انہوں نے اپنے شعراء کی عزت و عظمت کے اظہار کی خاطر واقعی ان قصائد کو کعبہ کے پردوں سے لٹکایا ہو۔ پھر اس امر کی مزید تائید عربوں کے اس معروف دستور سے ہوتی ہے کہ جب انہیں کسی تحریر کی عظمت مقصود ہوتی تو وہ اس کو خانۂ کعبہ کے پردوں پر آویزاں کر دیتے تھے۔ چنانچہ محمد بن حبیب نے قبیلہ خزاعہ اور عبدالمطلب کے مابین طے ہونیوالے

معاہدہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس کی عظمت شان کی خاطر یہ طریق اختیار کیا گیا تھا۔ پھر سیرۃ ابن ہشام میں مسلمانوں سے قطع تعلقی اور مکمل سماجی بائیکاٹ کرنے کے سلسلہ میں قریش کے باہمی معاہدہ کا ذکر آتا ہے جس کو انہوں نے حرمت و توقیر کی خاطر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا تھا پس اس لحاظ سے جمہور علماء کا موقف درست معلوم ہوتا ہے اور عربوں کے رائج الوقت دستور سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اب ذیل میں سبع معلقات کا اجمالی تعارف درج کیا جاتا ہے۔

رواۃ اس امر پر متفق ہیں کہ خانہ کعبہ میں جو قصیدہ سب سے پہلے لٹکایا گیا وہ عرب کے مشہور اور فصیح شاعر امرؤ القیس کا تھا۔ اس کا اصلی نام جندح تھا۔ کنیت ابو وہب اور ابو الحرث تھی۔ اس کو ذو القروح اور ملک ضلّیل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سعادت سے تقریباً چالیس سال پہلے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے متعلق فرمایا تھا۔

"ھو اشعر الشعراء وقائدھم الی النار"

کہ یہ امرؤ القیس بہترین شاعر بھی ہے اور باقی سارے شعراء کی جہنّم کی طرف راہنمائی کرنے والا بھی ہے۔

امرؤ القیس کو عرب شاعری میں بلند ترین مقام حاصل ہے اس نے نازک اور لطیف مضمون کو بہترین مثالوں اور استعاروں کی مدد سے خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ اس نے اپنے اشعار میں محبوبہ کے مکان کے کھنڈرات اور وہاں پر رونے کا بہت ذکر کیا ہے۔ تشبیہاتِ مرکب کا بکثرت استعمال اس کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے۔ اس کے قصیدہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

قِفَا نَبْكِ مِن ذِكرىٰ حبيبٍ ومنزلِ
بِسِقْطِ اللِّوىٰ بينَ الدَّخولِ فَحَومَلِ

قصیدہ میں کل ۸۱ شعر ہیں۔ روی لام ہے چنانچہ اس کو القصیدۃ اللّامیۃ کہاجاتا ہے۔ سارا قصیدہ بحرِ طویل میں ہے۔ اس میں اس نے اپنی چچازاد بہن عنیزہ کا ذکر کیا ہے۔ عرب شعراء کا طریق یہ تھا کہ وہ مضمون کسی ایک مقام سے شروع کرتے اور پھر یک لخت گریز کرتے ہوئے دوسرے مضمون کو شروع کر دیتے۔ چنانچہ امرؤ القیس نے بھی اس قصیدہ میں اپنے گھوڑے کی تعریف، اپنے شدائد و مصائب، اندھیری رات کے سفر اور اپنے دوستوں کی خدمت کرنے کا ذکر کیا ہے۔

دوسرا قصیدہ طرفۃ بن العبد البکری کا ہے۔ اس کا اصل نام عمر تھا۔ طرفۃ اس کا لقب تھا جو اس کو ایک شعر میں یہ لفظ استعمال کرنے پر دیا گیا۔ طرفہ، امرؤ القیس کا ہم عصر بلندپایہ شاعر تھا۔ یہ اپنی قوم اور شرافت کی وجہ سے اپنے زمانہ میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ طبعاً آزادی پسند تھا۔ جب اس کے ذہن میں کوئی خیال یا کوئی مضمون آجاتا تو پھر اس کے اظہار سے رُک نہ سکتا تھا خواہ اس کے اظہار سے کوئی نقصان ہی ہوتا ہو۔ شہنشاہِ وقت عمرو بن ہند نے

اس کو دشمنی کی بنا پر دھوکے سے قتل کروا دیا تھا۔ اس کو قتل سے قبل بادشاہ کے ارادہ کا علم ہو گیا تھا لیکن نہ وہ موت سے ڈرا اور نہ بادشاہ کے حکم سے روگردانی کرتے ہوئے بغاوت کی بلکہ موت کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔

طرفہ کو امرؤ القیس کے بعد بہترین شاعر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا معلقہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

لِخَولَةَ اَطْلَالٌ بِبُرْقَةِ ثَهْمَدِ
تَلُوحُ كَبَاقِي الْوَشْمِ فِي ظَاهِرِ الْيَدِ

اس قصیدہ میں کُل ۱۰۶ اشعار ہیں جو سب کے سب بحر طویل میں ہیں۔ اس کے قصیدہ کو القصیدۃ الدالیۃ کہا جاتا ہے۔ طرفہ نے اس قصیدہ میں اپنی شراب نوشی، اپنی شجاعت و بہادری اور اپنی اونٹنی کی بے حد تعریف کی ہے۔ اس نے بھی اپنی محبوبہ خولہ سے اپنی محبت کا ذکر کیا ہے۔

تیسرا قصیدہ مشہور شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ المزنی کا ہے۔ زہیر کا شمار عرب کے مشہور شعراء میں ہوتا ہے جو فصاحت و بلاغت میں بلند مقام رکھتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے زہیر کو اشعر الشعراء قرار دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زہیر اپنے کلام میں غیر مانوس الفاظ استعمال نہیں کرتا ہے اور نہ شاعروں کی خاص مدحیں لیتا ہے۔ محمد بن سلام نے زہیر کے کلام کو اس وجہ سے ترجیح دی ہے کہ اس کے اشعار میں ہزلیات کو مطلق دخل نہیں تھوڑے الفاظ میں زیادہ مطلب ادا کرتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت زہیر کی عمر سو برس کے قریب تھی حضورؐ نے فرمایا:۔

"اَللّٰهُمَّ اَعِذْنِي مِنْ شَيْطَانِهٖ"

کہ اے خدا تُو مجھے اس کے شیطان سے پناہ میں رکھنا۔ اس کے جلد بعد اس کی وفات ہو گئی۔ اس کے دونوں بیٹے کعب بن زہیر اور بجیر بن زہیر بعد ازاں مسلمان ہو گئے۔

اس قصیدہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ؎

اَمِنْ اُمِّ اَوْفٰى دِمْنَةٌ لَمْ تَكَلَّمِ
بِحَوْمَانَةِ الدَّرَّاجِ فَالْمُتَثَلَّمِ

قصیدہ بحر طویل میں ہے اور کُل ۶۴ شعر ہیں۔ اس قصیدہ میں زہیر نے قبیلہ بنی مرہ کے دو سرداروں ہرم بن سنان حارث بن عوف کی تعریف کی ہے کیونکہ انہوں نے قبائل کے درمیان بھڑک اٹھنے والی نار حرب کو بڑی حکمت اور دانائی سے بجھا دیا تھا ورنہ قریب تھا کہ ملک میں سخت کشت و خون ہوتا۔ زہیر اس قصیدہ کے شروع میں اپنی محبوبہ کا ذکر کرتا ہے اور پھر گریز کرتے ہوئے اصل مضمون کی طرف آتا ہے۔

چوتھا قصیدہ لبید بن ربیعہ کا ہے۔ ان کی کنیت ابو عقیل تھی۔ لبید اپنے وقت میں شریف شعراء میں مشہور

تھے ۔ بہادری، سخاوت اور اشعار گوئی میں ضرب المثل تھے ۔ یہ قبیلہ بنی کلاب کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد آپ نے قرآن مجید حفظ کیا۔ مدینہ کی ہجرت میں یہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے ۔ زمانۂ جاہلیت کے بہت عظیم شاعر تھے لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے کفر کے دیگر رسم و رواج کو ترک کرنے کے ساتھ شعر کہنا بھی چھوڑ دیا۔ قبولِ اسلام کے بعد ساری عمر انہوں نے کبھی شعر نہیں کہا۔ جب آپ سے وجہ پوچھی گئی تو کہا :-

" ما اقولُ الشعر بعد ان علّمنیَ اللہ سورۃ البقرۃ "

جب خدا تعالیٰ نے مجھ کو سورۂ فاتحہ سکھا دی ہے تو پھر میں کوئی شعر کہنا گوارا نہیں کر سکتا۔

لیکن ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے قبول اسلام کے بعد صرف دو شعر کہے ۔ ان میں سے بھی ایک کے متعلق شک کیا جاتا ہے ۔ دوسرا شعر جو بالاتفاق انہی کا ہے اور انہوں نے قبول اسلام کے بعد کہا یہ ہے ؎

ما عاتب المرءَ الکریمَ کنفسہ
والمرءُ یُصلحُہُ القرینُ الصالحُ

شعبی نے روایت بیان کی ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر بن الخطابؓ نے امیر مغیرہ کی طرف لکھا کہ اپنے شہر کوفہ کے مشہور شعراء کے کچھ اشعار لکھوا کر بھجوائیں تاکہ مجھے اُن کے خیالات کا علم ہو سکے ۔ جب مغیرہ نے لبید سے شعر لکھنے کو کہا تو انہوں نے کہلا بھیجا کہ زمانۂ جاہلیت کے جس قدر اشعار چاہیں مجھ سے لے لیں مگر مسلمان ہونے کی حالت میں تو اب خدا تعالیٰ نے مجھے قرآن مجید نعم البدل عطا کر دیا ہے ۔ اب مجھے شعر کی طرف کوئی رغبت نہیں رہی۔ انہوں نے ۱۴۵ سال کی عمر میں کوفہ میں وفات پائی ۔

لبید بن ربیعہ کے معلقہ کے کل ۸۹ اشعار ہیں جو سارے بحر کامل میں ہیں۔ معلقہ کا پہلا شعر یہ ہے ؎

عفت الدیار محلها فمقامها
بمنًی تأبّدَ غولُها فرجامُها

پانچواں قصیدہ عمرو بن کلثوم تغلبی کا ہے ۔ اس کی کنیت ابو الاسود تھی۔ عمرو بن کلثوم کو جب اپنی قوم کا سردار بنایا گیا تو اس کی عمر پچاس سال تھی ۔ عمرو طبع زاد مشہور شعراء میں سے ہے جس کے کلام کی بناوٹ عمدہ ہونے کے علاوہ معانی کے اعتبار سے بڑی واضح ہے ۔ یہ فخریہ اشعار کہنے میں خاص ملکہ رکھتا تھا ۔ عمرو نے ۱۵۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

اس قصیدہ کے کہنے کا باعث یہ امر ہوا کہ ایک روز عرب کے مشہور بادشاہ عمرو بن ہند نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ کیا تم کو کسی ایسے شخص کا علم ہے جس کی ماں میری ماں کی خدمت کرنے کو عار سمجھتی ہو۔ تو انہوں نے کہا کہ ہاں صرف

عمرو بن کلثوم کی ماں ہی ایسا کرنے کی جرأت کر سکتی ہے۔ عمرو بن ہند نے یہ سنا تو فوراً عمرو بن کلثوم اور اس کی والدہ کو بلا بھیجا۔ ان کے شایانِ شان استقبال اور مہمان نوازی کے بعد جب عمرو بن کلثوم کی والدہ لیلیٰ عمرو بن ہند کی والدہ کے ہمراہ ایک خیمہ میں بیٹھی تھی تو والدہ عمرو بن ہند نے سوچی سمجھی سکیم کے مطابق اسے ایک برتن پکڑانے کو کہا۔ لیلیٰ بھی غیور خاندان سے تعلق رکھتی تھی فوراً جواب دیا :-

" لتقم صاحبة الحاجة الیٰ حاجتها ۔"

کہ جسے ضرورت ہے وہ خود اُٹھے ۔

لیکن جب والدہ ہند کا اصرار بڑھا تو لیلیٰ چلائی " واذلاہ یا لتغلب " کہ ہائے تغلب قبیلہ کی ذلت کی جا رہی ہے ۔ عمرو بن کلثوم نے والدہ کی آواز سنی تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے عمرو بن ہند کی تلوار لیکر اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد خوب قتل و غارت ہوئی ۔ عمرو بن ہند کے سارے اونٹ لوٹ لیے گئے۔ چنانچہ اپنی بہادری کا تذکرہ کرتے ہوئے عمرو بن کلثوم نے یہ سارا قصیدہ کہا جس پر ساری قوم فخر کرتی ہے ۔ قصیدہ میں کل ۱۰۲ اشعار ہیں جو بحرِ وافر میں ہیں ۔ پہلا شعر یہ ہے ؎

اَلَا هُبّي بصحنك فَاَصْبَحِينَا

وَلَا تبقي خُمورَ الْاَنْدَرِيْنَا

قصیدہ کا ایک اور اہم شعر یہ ہے ؎

اَلَا لَا يَجْهَلَنْ اَحَدٌ عَلَيْنَا

فَنَجْهَلُ فَوْقَ جَهْلِ الجاهِلِيْنَا

چھٹا قصیدہ عنترہ بن شداد العبسی کا ہے ۔ ابن قتیبہ اور دیگر علماء کا خیال ہے کہ شداد عنترہ کا دادا تھا۔ بعض نے شداد کو عنترہ کا چچا بھی بیان کیا ہے ۔ بہر صورت شداد کا نام اس کے باپ کے طور پر زیادہ معروف ہے جبکہ اصل نام عمرو بن شداد تھا۔ عنترہ کا لقب الفلحاء ہے ۔ ماں کا نام زبیبہ تھا جو ایک حبشیہ کی لونڈی تھی ۔ اس وجہ سے عنترہ کو غلام شمار کیا جاتا تھا ۔ ابن کلبی کی روایت ہے کہ قبیلہ بنی عبس پر ایک دفعہ عرب کے لٹیروں نے حملہ کر دیا اور خوب غارت گری کی ۔ عبسیوں نے ان کا بڑی ہمت سے مقابلہ کیا۔ عنترہ کے باپ نے اس کو بھی لڑنے کو کہا لیکن اس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ میں تو غلام ہوں اور جنگ کرنا شریف اور آزاد لوگوں کا کام ہے ۔ یہ بات سن کر باپ نے اسے آزاد کر دیا اور کہا کہ " کُرّ و انت حُرّ " کہ تو دشمن پر حملہ کر تو آزاد ہو جائے گا۔ چنانچہ عنترہ نے دشمن پر حملہ کیا اور خوب دادِ شجاعت دی ۔ باپ نے خوش ہو کر اس کو اپنا بیٹا کہنا شروع کر دیا۔

عنترہ شاعر ہونے کے علاوہ مشہور شہسوار، متحمل مزاج اور فصیح بولنے والا انسان تھا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم

نے اس کا ایک شعر سُننے کے بعد فرمایا تھا :-

" ماوصف لی اعرابی قط فاحببتُ ان اراہُ الا عنترۃ "

کہ مجھے کبھی کسی اعرابی کی تعریف سُن کر اُس کو دیکھنے کا شوق پیدا نہیں ہُوا مگر میرا دل عنترہ کو دیکھنے کو چاہتا ہے ۔"

معلقہ لکھنے کا سبب یہ ہُوا کہ ایک روز کسی عبسی نے اس پر طعنہ زنی کی۔ عنترہ نے فوراً مُنہ توڑ جواب دیا۔ اس پر اس عبسی نے اس بات پر اپنی فضیلت کا اظہار کیا کہ وہ شعر گوئی میں اس سے بہت بڑھ کر ہے ۔ عنترہ کو غیرت آئی اس نے کہا کہ عنقریب فیصلہ ہو جائے گا کہ شعر گوئی میں فضیلت تم کو حاصل ہے یا مجھے ۔ چنانچہ اس کے بعد اس نے شعراء زمانۂ جاہلیت کی طرز پر فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بر شاندار قصیدہ بحر کامل میں لکھا ۔ اس کے کُل ۸۰ اشعار ہیں ۔ پہلا شعر یوں ہے

هل غادر الشعرآءُ من مُتَرَدَّمِ

اَمْ هَل عرفت الدّا ربعد توهّمِ

سبع معلقات میں سے آخری معلقہ الحارث بن حلزة بن یكرة الیشكری کا ہے ۔ حارث جنگ بسوس میں شامل ہُوا تھا ۔ حارث کے اشعار تھوڑے ہیں اور خوبی کلام کے لحاظ سے بھی زیادہ بلند پایہ نہیں لیکن اس کے معلقہ نے اس کو شہرت عطا کی اور زمانۂ جاہلیت کے مشہور شعراء کی صف میں لا کھڑا کیا ۔

اِس کے معلقہ کہنے کے متعلق لمبی کہانی ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ حارث نے یہ قصیدہ عمرو بن ہند کے دربار میں عمرو بن کلثوم کی موجودگی میں کہا تھا جس کو بہت پسند کیا گیا ۔ یہ دونوں اپنی اپنی قوم کی خاطر بادشاہ کی حمایت حاصل کرنے آئے تھے ۔ بادشاہ کو حارث کا قصیدہ اتنا پسند آیا کہ وہ اس کی جانب جُھک گیا ۔

معلقہ بحر خفیف میں ہے ۔ کُل ۸۳ شعر ہیں ۔ ابتداء اِس شعر سے ہوتی ہے ؎

اذنتنا ببینها اسماءُ

رُبَّ ثاوٍ یمَلُّ منهُ الثّواءُ

جیسا کہ مضمون کے شروع میں ذکر آ چکا ہے زیادہ شہرت اور عظمت مذکورہ بالا سات قصائد کو ہی حاصل ہے ۔ بقیہ تین قصائد کو بھی بعض لوگ اسی ذیل میں شمار کرتے ہیں جو علی الترتیب ابو بصیر الاعشی میمون عدنانی، ابوامامة النابغة الذبیانی اور عبید بن الابرص نے لکھے ہیں ۔

اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اصحابِ معلقات میں سے اشعر الشعراء (سب سے اعلیٰ اور بلند پایہ شاعر) کون ہے ۔ معلقات کے لکھے جانے کے وقت سے آج تک اِس بارہ میں اختلاف چلا آیا ہے اور کبھی بھی علماء کسی ایک شاعر کے بارہ میں اتفاق رائے نہیں کر سکے ۔ اتفاق ہو بھی کس طرح سکتا ہے جبکہ آراء میں بُعد المشرقین ہے ۔ فرزدق نے امرؤ القیس،

جریر نے النابغہ، ابن مقبل نے طرفہ، ابن احمر نے زہیر، الحمیت نے عمرو بن کلثوم، ذوالرمہ نے لبید اور الاخطل نے الاعشیٰ کو اشعر الشعراء قرار دیا ہے۔ ابو عبیدہ نے ان سب آراء کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ دیا ہے۔ کہ امرؤ القیس ان سب سے بڑا ہے۔ اس کے بعد علی الترتیب زہیر، نابغہ، الاعشیٰ، لبید، عمرو بن کلثوم اور طرفہ کا نمبر آتا ہے۔ ہر ایک شاعر کو ان کے مداحوں نے اس کے اشعار کے مختلف نمایاں اوصاف کی بنا پر یہ مرتبہ دیا ہے۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ جب نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں امرؤ القیس کا ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:۔

"ھو قائدھم و حامل لوائھم"

حضرت عمر بن الخطابؓ نے نابغہ ذبیانی کے تین اشعار پیش کرتے ہوئے اسے اشعر الشعراء قرار دیا ہے۔

بہترین شاعر کے انتخاب میں اگرچہ علماء نے اختلاف کیا ہے تاہم یہ امر سب کو مسلّم ہے کہ یہ سب معلقات زمانۂ جاہلیت کی شاعری کا بہترین نمونہ ہیں جو اس دور میں پورے وثوق کے ساتھ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان قصائد میں فصاحت و بلاغت اور سلاست بیانی کے پہلو بہ پہلو زمانۂ جاہلیت کی تہذیب و معاشرت کے نقوش بھی ملتے ہیں۔ عربی تمدن کی بہترین عکاسی کرنے کے لحاظ سے ان قصائد کو اس زمانہ کے مأخذ کے طور پر بھی اہم سمجھا جاتا ہے۔ ان گوناگوں صفات کی وجہ سے معلقات کو عربی ادب میں ایک بلند مقام حاصل ہے +

○

ترا جلوہ اک ایسا راز ہے فطرت کے سینے میں

جو اہلِ دل پہ کھل کر بھی سراپا راز ہوتا ہے

جہاں ہوش و خرد کی وسعتیں دم توڑ دیتی ہیں

مرے معبود تیرے نام کا آغاز ہوتا ہے

○

داؤد طاہر
بی-اے (سالِ اوّل)

ہمارا قومی ادارہ
تعلیم الاسلام کالج۔ ربوہ
تعارف

ہماری درسگاہ ـــــ تعلیم الاسلام کالج ـــــ کا قیام اوّلاً مئی ۱۹۰۳ء میں ہوا مگر ۲ سال بعد ہی یونیورسٹی کی طرف عائد ہونے والی بعض ناقابلِ عمل شرائط کی بنا پر اسے بند کر دینا پڑا۔ تقریباً چالیس سال بعد اوائل جون ۱۹۴۴ء میں حضرت امام جماعتِ احمدیہ کے دستِ مبارک سے پھر اس کا احیاء ہوا۔ آج تک خدا کے فضل سے یہ کالج بڑی کامیابی اور خیر و خوبی کے ساتھ چل رہا ہے اور اس وقت اس کا شمار ملک کی چوٹی کی درسگاہوں میں ہوتا ہے۔ جناب پروفیسر حمید احمد صاحب وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے الفاظ میں :-

> "یہ کالج، دوسری غیر سرکاری درسگاہوں کی طرح، ہمارے قومی نظامِ تعلیم میں ایک خاص مقام رکھتا ہے ...... مجھے اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ قومی جماعتوں اور انجمنوں کی قائم کی ہوئی درسگاہیں اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود ہماری اجتماعی زندگی میں ایک بنیادی ضرورت کو پورا کر رہی ہیں اور ان کے نہ ہونے سے ہماری زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگا۔"[1]

ذیل میں کالج کا سوانحی خاکہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ قارئینِ المنار کی خدمت میں پیش ہے۔

تعلیم الاسلام کالج کا دورِ اوّل ـــــ مدرسہ تعلیم الاسلام تا تعلیم الاسلام کالج

۱۸۹۸ء سے قبل قادیان ـــــ مرکز جماعتِ احمدیہ ـــــ میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے ۲ سکول تھے۔ یہ سکول چونکہ کلی طور پر بالواسطہ یا بلاواسطہ غیر مسلموں خصوصاً متعصب آریوں کے زیر اثر تھے اسلئے ان میں تعلیم پانے والے مسلمان طالبعلموں

[1] خطبہ اسناد تعلیم الاسلام کالج ربوہ مورخہ ۶/۲/۶۲ مطبوعہ الفضل مورخہ ۷/۶/۶۲ ء

کو لازماً ایک ناقابلِ تلافی روحانی نقصان پہنچ رہا تھا۔

حضرت مرزا غلام احمد صاحب بانیٔ سلسلہ احمدیہ نے اس صورتِ حال کو بڑی شدت سے محسوس فرمایا اور ۱۵ ستمبر ۱۸۹۷ء کو مسلمان ذریت کو عیسائیت، الحاد اور مغربی تہذیب کی ہلاکت آفرینیوں سے بچانے کے لئے نیز انہیں اسلام کا مخلص خادم بنانے کی غرض سے قادیان میں ایک مثالی اسلامی درسگاہ کے قیام کی بذریعہ اشتہار تحریک فرمائی اور اس مدرسہ کے قیام کا مقصد بایں الفاظ بیان فرمایا۔

"میں مناسب دیکھتا ہوں کہ بچوں کی تعلیم کے ذریعہ سے اسلامی روشنی کو ملک میں پھیلاؤں ..... ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ اس طوفانِ ضلالت میں اسلامی ذریت کو غیر مذاہب کے وساوس سے بچانے کے لئے اس ارادہ میں میری مدد کرے۔ سو میں مناسب دیکھتا ہوں کہ بالفعل قادیان میں ایک مڈل سکول قائم کیا جائے۔"[1]

پھر ایک اور مرتبہ فرمایا:۔

"ہماری غرض مدرسہ کے اجراء سے محض یہ ہے کہ دین کو دنیا پر مقدم کیا جائے۔ مروجہ تعلیم کو اس لئے ساتھ رکھا ہے تاکہ یہ علوم خادمِ دین ہوں۔"[2]

اسی نیت اور اسی ارادہ کے ساتھ باوجود مالی اور دیگر قسم کی مشکلات کے ۳ جنوری ۱۸۹۸ء کو اس مدرسہ کا افتتاح کر دیا گیا۔ محض خدا کے فضل سے یہ مدرسہ جو ابتدائی صورت میں پرائمری تھا اُسی سال مڈل سکول بن گیا۔ فروری ۱۹۰۰ء میں اسے ہائی سکول کا درجہ دیدیا گیا اور اس کے بعد تین سال کے قلیل عرصہ کے اندر اندر مئی ۱۹۰۳ء میں کالج بن گیا[3] اور نام اس کا "تعلیم الاسلام کالج" تجویز ہوا۔

اس کالج کی تاریخِ افتتاح ۱۵ مئی ۱۹۰۳ء قرار پائی تھی مگر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی علالت کی وجہ سے وہ تاریخ ملتوی کر دی گئی اور ۲۸ مئی کا دن مقرر ہوا۔ اس دن بھی بوجہ ناسازیٔ طبع آپ تشریف نہ لا سکے اور حضرت مولانا نور الدین صاحب[4] نے تقریبِ افتتاح کی صدارت فرمائی۔

---

[1] تبلیغ رسالت جلد ششم صفحہ ... مرتبہ میر قاسم علی صاحب مرحوم ایڈیٹر "فاروق"۔ [2] الحکم ۱۰ دسمبر ۱۹۰۲ء۔ [3] تاریخ احمدیت مولفہ مولانا دوست محمد صاحب شاہد ناشر ... حصہ دوم صفحہ ... ۔ [4] آپ بعد میں جماعت احمدیہ کے خلیفہ اول ہوئے۔ اپنے وقت کے چوٹی کے طبیب تھے۔ حضرت مسیح موعودؑ نے آپ کے متعلق فرمایا:

چہ خوش بودے اگر ہر یک ز امت نور دیں بودے ۞ ہمیں بودے اگر ہر دل پر از نور یقیں بودے

اخبار "زمیندار" لاہور نے آپ کی وفات پر لکھا "..... مولانا حکیم نور الدین کی شخصیت اور قابلیت ضرور اس قابل تھی کہ تمام مسلمانوں کو رنج و افسوس کرنا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ زمانہ سو برس تک گردش کرنے کے بعد ایک باکمال پیدا کیا کرتا ہے۔ الحق اپنے تبحرِ علم و فضل کے لحاظ سے مولینا حکیم نور الدین بھی ایسے ہی باکمال تھے۔ افسوس ہے آج ایک فردِ دستِ عالم ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔" ("حیاتِ نور" از شیخ عبد القادر صاحب صفحہ ۴۲...)

گو حضور جسمانی طور پر افتتاحی اجلاس میں شرکت نہ فرما سکے تھے تاہم اس کالج کو اپنی خصوصی دعاؤں سے نوازا۔ آپ حضرت نواب محمد علی خان صاحبؓ[1] کو خط لکھتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :۔

"رات سے مجھے دل کے مقام پر درد ہوتی تھی اس لیے حاضر نہیں ہو سکا لیکن میں نے اسی حالت میں بیت الدعا میں اس کالج کے لیئے بہت دعا کی ..... خدا تعالیٰ قبول فرمائے"[2]

اس کالج کے ڈائریکٹر حضرت نواب محمد علی خان صاحبؓ مقرر ہوئے جو اپنا قریباً سارے کا سارا وقت کالج کو دیتے رہے۔ نیز گرانقدر عطیات سے بھی نوازتے رہے۔

اس کالج کا ابتدائی سٹاف ذیل کے ممبران پر مشتمل تھا :۔

حضرت مولوی شیر علی صاحبؓ[3] پرنسپل و پروفیسر انگریزی، حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ[4] مینجر و پروفیسر منطق، حضرت حکیم مولوی عبید اللہ صاحبؓ[5] بسمل پروفیسر فارسی، حضرت مولوی سرور شاہ صاحبؓ[6] پروفیسر عربی و دینیات، جناب مولوی محمد علی ایم۔اے[7] پروفیسر ریاضی۔

اس کالج کو یہ شرف بھی حاصل ہو کہ حضرت مولانا نورالدین صاحبؓ کچھ عرصہ یہاں دینیات پڑھاتے رہے۔

کالج کے ابتدائی طلبہ میں سے حافظ صوفی غلام محمد صاحب مرحومؓ مبلغ ماریشس، ڈاکٹر غلام محمد صاحب مرحوم ایم بی بی ایس

---

[1] مالیر کوٹلہ کے نواب خاندان میں سے تھے۔آپ کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی دامادی کا شرف بھی حاصل ہوا۔

[2] "اصحاب احمد" مرتبہ جناب ملک صلاح الدین صاحب ایم۔اے۔

[3] حضرت مولانا صفِ اوّل کے ان مجاہدین میں سے تھے جن کی پوری عمر سلسلہ کی قلمی خدمت میں گزری۔آپ کی ... علمی قابلیت کے باعث آپکو جج کا عہدہ پیش کیا گیا مگر آپ نے دینی خدمت کو ترجیح دی تعلیم الاسلام ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر بھی رہے۔برسوں "ریویو آف ریلیجنز" کی ادارت کی۔کتاب "قتلِ مرتد اور اسلام" آپ کا ہی قلمی شاہکار رہے۔زندگی کے آخری دور میں قرآن مجید کے انگریزی ترجمہ و تفسیر پر مقرر ہوئے۔اسی سلسلہ میں یورپ کا سفر بھی اختیار کیا۔وفات ۱۹۴۷ء (تاریخ احمدیت جلد دوم ص۴۱۳)

[4] احمدیہ مسلم مشن امریکہ کے بانی تھے۔یورپ کی متعدد یونیورسٹیوں نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں دیں۔وفات ۱۹۵۷ء۔

[5] آپ فارسی زبان پر عبور کامل رکھتے تھے ---- ارجح المطالب، مدد بزرا اسلام فارسی، مرآۃ الاسلام، ترجمان پارسی، حق الیقین، حیاتِ بسمل اور فارسی بول چال آپ کی مشہور کتب ہیں۔ (حیاتِ بسمل ٹائیٹل پیج)

[6] رسالہ تعلیم الاسلام اور ریویو آف ریلیجنز (اردو) کے ایڈیٹر رہے۔تفسیر سروری آپ کا ہی کارنامہ ہے۔

[7] ایل ایل بی بھی تھے۔کچھ عرصہ اسلامیہ کالج لاہور میں بھی ریاضی کے پروفیسر رہے مارچ ۱۸۹۲ء میں پہلی دفعہ قادیان گئے۔ایسا اثر ہوا کہ فوراً بیعت کر لی۔ریویو آف ریلیجنز (انگریزی) کی چودہ سال تک ادارت کی۔صدر انجمن احمدیہ کی سیکرٹری شپ کے فرائض ایک مدت تک سرانجام دیتے رہے۔قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا ہے اور تفسیر بھی۔۱۹۱۴ء میں اختلاف کے بعد قادیان سے چلے گئے۔(تاریخ احمدیت حصہ دوم ص۴۰۳)

لاہور، شیخ عالم دین صاحب مرحوم بی۔ اے، ایل ایل۔ بی شیخوپورہ اور جناب مولوی محمد دین صاحب ناظر تعلیم خاص طور پر قابل ذکر ہیں[1]
اس کالج کی کارکردگی بہت اعلیٰ تھی، نتائج بھی عمدہ تھے ..... مگر حکومت کے کالج یونیورسٹی کمیشن کی کڑی شرائط کے باعث اسے دو سال کے بعد بند کر دینا پڑا[2]۔

تعلیم الاسلام کالج کا دورِ ثانی

وہ دعائیں جو حضرت مسیح موعودؑ نے بڑے ہی درد و الحاح کے ساتھ خدا تعالیٰ کے حضور مقدس بیت الدعا میں کالج کے افتتاح کے موقعہ پر کی تھیں رائیگاں نہیں گئیں۔ آخر کار وہ رنگ لائیں اور تقریباً ۴ سال کے بعد تعلیم الاسلام کالج نے حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب امام جماعت احمدیہ کی زیر نگرانی پہلے سے کہیں زیادہ شان کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔

کالج کے قیام کی تحریک

۱۹۴۲ء کی مجلس مشاورت سے چند دن بعد بجٹ کی مخصوص سب کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں بغیر کسی قبل از وقت سوچی ہوئی تجویز کے حضرت امام جماعتِ احمدیہ نے کالج کے قیام کی تحریک فرمائی جسے خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے غیر معمولی شرفِ قبولیت سے نوازا اور کئی ہزار روپیہ نقد اور وعدوں کی صورت میں ان گنتی کے احباب سے ہی جمع ہو گیا۔

کالج کے قیام کی اجازت حاصل کرنے کے لئے کافی تگ و دو کے بعد پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ایک کمشن موقعہ پر حالات کا معائنہ کرنے کے لئے ۲۲ جنوری ۱۹۴۳ء کو قادیان آیا۔ اس نے نظامِ سلسلہ کی پختگی اور تعلیم الاسلام ہائی سکول کی شاندار عمارات اور وسیع اراضیات کو دیکھ کر یونیورسٹی میں احمدیہ کالج کے قیام کی منظوری دیئے جانے کی سفارش کی۔ اس کے بعد یونیورسٹی کے اس مطالبہ کو پورا کئے جانے پر کہ ۴۵۰۰۰ روپیہ نقد مجوزہ احمدیہ کالج کے نام پر کسی بنک میں جمع کیا جائے، پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے ۱۱ فروری ۱۹۴۳ء کے اجلاس میں یونیورسٹی کی سینٹ کے پاس یہ سفارش کی کہ احمدیہ کالج کے قیام کی منظوری دے دی جائے۔ سینٹ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۵ مارچ ۱۹۴۳ء میں مطلوبہ منظوری دیکر آخری منظوری کے لئے گورنمنٹ کے پاس سفارش کر دی۔ ..... ۲ جون ۱۹۴۳ء کو بذریعہ تار یونیورسٹی کی طرف سے اطلاع آگئی کہ گورنمنٹ نے کالج کے اجراء کی منظوری دے دی ہے۔

شروع میں کالج کے لئے ذیل کا سٹاف مقرر ہوا :-

مکرم محترم صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب ایم۔ اے، آکسن (پرنسپل و لیکچرار اکنامکس)، مکرم اخوند عبدالقادر صاحب ایم۔ اے (لیکچرار انگریزی)، مکرم عباس بن عبدالقادر صاحب ایم۔ اے (لیکچرار تاریخ)، مکرم عبدالرحمن صاحب ناصر

---

[1] "اصحاب احمد" مشتمل بر حالات حضرت نواب محمد علی خان صاحبؓ (صفحہ ۱۸۲) [2] تاریخ احمدیت جلد سوم صفحہ ۳۲۴)

ایم۔اے (لیکچرار حساب)، مکرم چوہدری محمد علی صاحب بی۔اے آنرز (لیکچرار فلاسفی)، مکرم بشارت الرحمٰن صاحب ایم۔اے (لیکچرار عربی)، مکرم عطاء الرحمٰن صاحب ایم ایس سی (لیکچرار فزکس)، مکرم چوہدری عبد الاحد صاحب ایم ایس سی (لیکچرار کیمسٹری)، مکرم مولوی محمد نذیر صاحب مولوی فاضل و منشی فاضل (لیکچرار اُردو و فارسی)[1]

ابتداءً اس کالج کی شکل ایک انٹرمیڈیٹ کالج کی تھی جس میں آرٹس و سائنس کے تمام مضامین باستثنائے میڈیکل گروپ پڑھائے جاتے تھے۔

کالج کے یوم افتتاح تک کُل ۱۵ طلبہ داخلہ لے چکے تھے، جن کے مضامین کی تفصیل اس طرح تھی:۔ سائنس ۲۴، آرٹس ۱۷۔۔۔ ان میں سے ۲۶ نے کیمسٹری، ۱۶ نے اکنامکس، ۲۱ نے عربی، ۲۳ نے فارسی، ۶ نے میتھ اور ۶ نے فلاسفی کے مضامین رکھے۔[2]

۴ رجون ۱۹۴۴ء کو اس کا افتتاح حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب، امام جماعت احمدیہ کے مبارک ہاتھوں سے ہُوا۔ آپ نے اپنی افتتاحی تقریر میں اس کالج کے قیام کی غرض و غایت اور مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا:۔

"ایک مقصد تو اشاعت تعلیم ہے"

"ہمارے کالج کے قیام کی ایک غرض یہ بھی ہے کہ مذہب پر جو اعتراضات مختلف علوم کے ذریعہ کئے جاتے ہیں ان کا انہی علوم کے ذریعہ سے ردّ کیا جائے اور ہمارے کالج میں جہاں ان علوم کو پڑھانے پر پروفیسر مقرر ہوں وہاں ان کا ایک یہ کام بھی ہو کہ وہ انہیں علوم کے ذریعہ ان اعتراضات کو ردّ کریں اور دنیا پر ثابت کریں کہ اسلام پر جو اعتراضات ان علوم کے نتیجہ میں کئے جاتے ہیں وہ سر تا پا غلط ہیں۔"[3]

تعلیم الاسلام کالج کا نازک ترین دور

۱۹۴۶ء میں کالج میں ڈگری کلاسز بھی جاری کر دی گئیں لیکن ایک سال بعد متحدہ ہندوستان، ہندوستان اور پاکستان دو علیحدہ علیحدہ خود مختار مملکتوں میں بٹ گیا۔ اُس وقت تعلیم الاسلام کالج پر کیا بیتی؟ اس کی رُوداد خود ادارہ کے پرنسپل کے الفاظ میں ہی سُنیئے:۔

"۱۹۴۷ء کے فسادات کی آگ میں جہاں ہزاروں لاکھوں مسلمان افراد تباہ ہوئے اور لاکھوں کو اپنی جائدادیں اور مال و اسباب چھوڑ کر اپنی عزتیں بچا کر یا انہیں بھی برباد کر کے پاکستان میں پناہ لینی پڑی وہاں مسلمانوں

---

[1] حوالہ کے لیے دیکھئے رپورٹ اسسٹنٹ سیکرٹری کالج کمیٹی جناب ملک غلام فرید صاحب ایم۔اے مطبوعہ الفضل ۸ رجون ۱۹۴۴ء۔

[2] تفصیل کے لئے دیکھئے رپورٹ پرنسپل بر موقع افتتاح تعلیم الاسلام کالج (قادیان) مطبوعہ الفضل نمبر ۱۳۳ جلد ۳۲۔

[3] "تعلیم الاسلام کالج کے قیام کی غرض و غایت" صفحہ ۲

کے قومی اداروں، خصوصاً تعلیمی اداروں نے ناقابلِ تلافی نقصان اُٹھایا۔ ان اداروں میں ہمارا تعلیم الاسلام کالج
بھی تھا۔ قادیان پر سکھوں کے منظم حملہ سے پہلے ہمارے کالج کو افسرانِ حکومتِ ہند نے خالی کروا کے سربمہر
کر دیا جس کے نتیجہ میں کالج کی شاندار عمارت، اس کی جدید ترین عمل گاہیں اور اس کے کھیل کے فراخ میدانوں
کے علاوہ ہمیں اپنی بہترین لائبریری، جدید آلاتِ سائنس اور اپنے سارے فرنیچر سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ غرضیکہ
ہر اس چیز کو جس سے کالج بنتا ہے ہم قادیان میں چھوڑ کر اور صرف کالج کا نام اور کالج کے اساتذہ لے کر
پاکستان پہنچے ..... ان حالات میں ہم میں سے ہر ایک کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا جماعتِ احمدیہ
ابتلاء کے اس دور میں کالج کو از سرِ نو جاری کرنے کے بھاری اخراجات کی متحمل ہو سکے گی؟ مگر حضرت ....
امام جماعتِ احمدیہ کی اولوالعزمی نے مسلمانانِ مشرقی پنجاب پر اَن گنت مظالم ڈھانے والوں کے چیلنج کو
قبول کیا اور ارشاد فرمایا کہ کالج جاری رہے گا ...... نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کے لئے ایک اصطبل ہمیں ملا جہاں
پہلے بھینسیں بندھتی تھیں وہاں اب ملت کے نوجوان ذہنوں کی جلا کا سامان ڈھونڈنے لگے۔ فرنیچر،
کتب خانہ، کھیل کے میدان، سامانِ سائنس غرضیکہ ہمارے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ طلبہ کی تعداد
بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ کالج کے غیر مسلم طلبہ مشرقی پنجاب میں ہی رہ گئے تھے۔ مسلم طلبہ کی بھاری اکثریت
نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکی ..... گو پاکستان آکر تعلیم جاری رکھنے والوں کی
بھاری اکثریت کالج کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی پھر بھی اُن کی تعداد ساٹھ سے بڑھ نہ سکی۔ پس ۱۹۴۷-۴۸ء
کو ہم بے سروسامانی کا دور کہہ سکتے ہیں۔ اور جن نوجوانوں نے اپنے کالج کے اس نازک ترین دور
کو ہمت اور بشاشت سے گزارا وہ یقیناً قابلِ قدر ہیں۔ خاصی تگ و دو اور ناظم تعلیماتِ عامہ پنجاب کے
ہمدردانہ رویہ کے نتیجہ میں ۱۹ مئی ۱۹۴۸ء کو کالج کی آبادکاری کے لئے D.A.V کالج کے کھنڈرات
پر ہمیں قبضہ ملا۔ ان عمارتوں کو غیر مسلم پناہ گزین کلی طور پر تباہ و برباد کر چکے تھے۔ دروازوں کے تختے
اور چوکھٹے، روشندان، الماریاں وغیرہ ہر قسم کا فرنیچر غائب تھا۔ عمل گاہوں میں ٹوٹی ہوئی شیشیوں کے
بکھرے ہوئے ٹکڑوں کے سوا کچھ موجود نہ تھا۔ پانی اور گیس کے نل ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔ تیس چالیس ہزار
کتابوں پر مشتمل مشہور کتب خانے کی اب ایک جلد بھی باقی نہ تھی۔ یہ وہ کھنڈر تھے جن میں مئی ۱۹۴۸ء میں ہم
آباد ہوئے اور ہماری توجہ ان ضروری اور ناگزیر مرمتوں کی طرف منعطف ہوئی۔ چنانچہ شروع میں گیس پلانٹ
کو درست کروایا گیا اور شعبہ کیمیا کے لئے ضروری سامان خرید کر کیمیا کے عملی تجربے شروع کروا دیئے گئے۔
طبیعات کے لئے ایم۔ اے۔ او کالج سے انتظام کرنا پڑا ..... چونکہ ابھی تک اصل ہوسٹل پر قبضہ نہ ملا
تھا اس لئے کالج کے ہی ایک حصہ کو مرمت کر کے عارضی طور پر ہوسٹل بنا دیا گیا جس میں اندازاً پچاس پچیس

طلباء کی رہائش کی گنجائش تھی جو وقتی طور پر کافی سمجھی گئی گو عملاً طلباء اس سے بہت زیادہ آگئے جس کے نتیجہ میں ایک ایک کمرہ میں آٹھ آٹھ طلباء کو رہنا پڑا۔[1]

ملک خادم حسین صاحب کیپٹن اپنی کتاب "ربوہ" میں رقمطراز ہیں :۔

"اُس زمانہ کی بے سروسامانی کا اِس امر سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُن ایام میں طلباء دن کے وقت چٹائیوں پر بیٹھ کر سبق حاصل کرتے اور پھر انہی چٹائیوں پر رات کو سو رہتے"[2]

اِن تمام حالات کے باوجود کالج بڑی خوبی سے چلتا رہا۔ اس کے نتائج خدا تعالیٰ کے فضل سے بہت عمدہ رہے۔ مثلاً ۵۰-۱۹۴۹ء کے دَوران بی۔اے کے سالانہ امتحان میں پنجاب یونیورسٹی کی اوسط ۳۹ر۸ تھی جبکہ تعلیم الاسلام کالج کی اوسط ۸۲ر۸ فیصد رہی۔ اسی طرح کھیل کے میدان میں بھی کالج نے کافی ترقی کی۔ چنانچہ اِس سال ہاکی کے یونیورسٹی ٹورنامنٹ کی بی لیگ میں ہمارا کالج چیمپئن رہا نیز دو طالب علم یونیورسٹی ٹیم میں بھی منتخب ہوئے۔ کشتی رانی کی ٹیم نے پنجاب روئنگ ایسوسی ایشن کے سالانہ "گالا" کے موقعہ پر اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اسی طرح روئنگ ایسوسی ایشن کے ٹورنامنٹ میں تین تین کی دَوڑ میں ہماری ٹیم دوم رہی۔ تیراکی میں باوجود تالاب نہ ہونے کے ایک طالبعلم پنجاب اور یونیورسٹی کی ٹیموں میں منتخب ہوا۔ اُس نے کُل پاکستان تیراکی کے مقابلوں میں دوم پوزیشن حاصل کی۔ ہائیکنگ کلب کے ارکان نے سون وادی، نہار وادی، کہون وادی اور جھنگڑ کے علاقے کو دیکھا۔ عسکری تربیت کے سلسلہ میں فیلڈ ٹیکٹکس کے مظاہرہ کے وقت ہمارے کالج کے ایک طالب علم سارجنٹ بشارت احمد کی ہز ایکسیلنسی کمانڈر انچیف افواجِ پاکستان نے بہت تعریف کی۔ نیز شہنشاہِ ایران کی لاہور میں آمد پر جس دستہ نے اُسے گارڈ آف آنر پیش کیا اُس میں ہمارے کالج کے تقریباً ۸۰ نوجوان تھے۔ نیز مختلف علمی سوسائٹیاں بڑے زور شور سے مصروفِ عمل رہیں۔[3]

یہی وجہ تھی کہ جب نومبر ۱۹۵۴ء میں کالج لاہور سے ربوہ منتقل ہوا تو ہر علم دوست شخص کو لاہور میں اس کی کمی محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ وہاں کے ایک کثیر الاشاعت روزنامہ نے لکھا :۔

"ایک اَور کمی متوسط طبقہ کے طلبہ کو سختی سے محسوس کرنی پڑے گی وہ تعلیم الاسلام کالج کا لاہور سے ربوہ منتقل ہو جانا ہے۔ مَیں متعلقہ حکام سے درخواست کرتا ہوں کہ اِس مسئلہ کی طرف فوری توجہ کرتے ہوئے موجودہ تعطیلاتِ گرما کے اختتام کے ساتھ ہی تعلیم الاسلام کالج کی کمی کو پورا کرنے کے لئے لاہور میں کسی مناسب جگہ پر ایک نیا کالج کھول دیا جائے"[4]

۱؎ الفضل ۱۵ اپریل ۱۹۵۰ء ۔ ۲؎ ایڈیشن اول ص۱۴۷ ۔ ۳؎ تفصیل کے لئے دیکھئے رپورٹ تعلیم الاسلام کالج ۵۰-۱۹۴۹ء مطبوعہ الفضل جلد ۳۸/۴ ص۸ ۔ ۴؎ نوائے وقت ۳۱ اگست ۱۹۵۴ء +

تعلیم الاسلام کالج ربوہ میں

قادیان سے ہجرت کے بعد ضروری ہو گیا تھا کہ جماعت احمدیہ کے لئے کوئی مرکز بنایا جائے۔ اسی غرض کے لئے آج سے سولہ سال قبل ان تپتے ہوئے صحراؤں اور بے آب وگیاہ ویرانوں میں جہاں سے گرد و پیش کے لوگ دن کے وقت بھی گزرتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ حضرت خلیفۃ المسیح الثانی نے ابراہیمی دعاؤں کے ساتھ ۲۰ ستمبر ۱۹۴۸ء کو "ربوہ" کی بنیاد رکھی۔ چند ابتدائی سالوں میں ہی یہاں کئی تعلیمی ادارے قائم ہو گئے جن میں سے جامعہ احمدیہ، جامعہ نصرت اور نصرت گرلز ہائی سکول کے نام خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لڑکوں کے کالج کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ۲۶ جون ۱۹۵۳ء کو حضرت امام جماعتِ احمدیہ نے ربوہ میں تعلیم الاسلام کالج کا سنگِ بنیاد رکھا اور کالج کی بنیاد میں دار المسیح قادیان کی ایک بابرکت اینٹ نصب فرمائی۔ اجتماعی دعا کے بعد دس بکرے صدقہ کئے گئے۔

اس کے بعد تعمیر کا کام بڑے زور وشور سے شروع کر دیا گیا۔ کالج کے ابتدائی معائنہ کے لئے پنجاب یونیورسٹی کا ایک وفد (جو ڈاکٹر نیاز صاحب، ڈائریکٹر کیمیکل ٹیکنالوجی اور مکرم تاج محمد صاحب خیال پر مشتمل تھا) ۲۴ جولائی ۱۹۵۴ء کو ربوہ وارد ہوا۔ ("ربوہ" صفحہ ۱۴۸)

۶ دسمبر ۱۹۵۴ء کو حضرت امام جماعتِ احمدیہ نے اس کالج کا افتتاح فرمایا اور اگلے دن سے کالج نے اپنا کام باقاعدہ شروع کر دیا۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے الفضل مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۵۴ء)

(باقی)

"ادنیٰ سے ادنیٰ انسان مثلاً ایک چرواہا جو صحرا میں فرشِ زمین پر لیٹا ہے یا ایک کمہار جو مٹی ڈھو رہا ہے تمہیں بہت سی ایسی باتیں بتا سکتا ہے جنہیں تم نہیں جانتے۔"

(ہربرٹ سپنسر)

(مرسلہ صفی اللہ صادق)

اقبال احمد نجم بی۔اے

علم و عمل

ایک مفکر کا قول ہے کہ "بے مقصد جینے سے مرنا بہتر ہے" حقیقت بھی یہی ہے کہ جس انسان کی زندگی کا مقصد متعین نہ ہو اس کی زندگی بالکل بے کار اور عبث ہے۔ ذرا اندازہ کیجئے کہ جس راہی کو اپنی منزل کا علم نہ ہو اس کے قدموں میں ثبات اور چال میں روانی کس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ ایسا مسافر اول تو سفر پر روانہ نہ ہوگا کیونکہ اسے کسی منزل پہ پہنچنا مقصود نہیں اور اگر دوسروں کی دیکھا دیکھی روانہ ہو جائے تو جب اس کی منزل ہی متعین نہ ہوگی اس کی کامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا بے مقصد مسافر بہت جلد زندگی کے پُر پیچ راستوں میں گُم ہو کر رہ جائے گا کیونکہ جادۂ حیات پر کامیابی و کامرانی سے چلنے کے لئے ایک واضح اور معین مقصدِ حیات دلیلِ راہ کا حکم رکھتا ہے۔

ہر قوم اور ہر ملت کا ایک نصب العین ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر عقلمند فرد، قوم بھی اپنی زندگی کا ایک مقصد معین کرتا ہے مختلف تعلیمی، تجارتی، ثقافتی، صنعتی اور سماجی اداروں نے بھی اپنے لئے مخصوص لائحہ عمل تجویز کیے ہوتے ہیں۔ ہمارے پیارے تعلیم الاسلام کالج کے طلباء کا نصب العین یا ماٹو "علم و عمل" ہے جو صوری و معنوی ہر لحاظ سے جامع ہے اور وابستگانِ کالج کو ان کے مقام کا احساس دلاتا ہے۔

علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں اور اس سے مراد کسی خاص شعبۂ حیات کی تفصیلات اور اسرار سے واقفیت حاصل کرنا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ :۔

طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مُسلمٍ و مُسلمۃٍ

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مسلمان عورت پر فرض ہے حصولِ علم کا مرتبہ عبادت کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

علم وہ گراں مایہ سرمایۂ حیات ہے جو نوعِ انسان کے لئے ہر دو جہان میں عزت و سرخروئی کا موجب بنتا ہے علم سے انسان کو اپنے خالقِ حقیقی کے وجود کا پتہ لگتا ہے۔ وہ اسی علم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور طاقتوں سے آگاہ ہوتا ہے مصنوعاتِ دنیا کو دیکھ کر اور ان کی تفصیلات پر غور کر کے اس کے ایمان و یقین میں ترقی اور مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔ علم کی بدولت اس میں اصابتِ رائے، دور اندیشی، بلند ہمتی، عزم کی پختگی اور نکتہ سنجی کی صفات جلوہ گر ہوتی

ہیں۔ وہ اپنے علم کی بنا پر سوسائٹی میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

الغرض یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ علم انسانیت کا زیور ہے جس کے بغیر انسان کے کمالات اور فضائل کا اظہار نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے علم کی ہر جگہ قدر ہوتی ہے۔ جب بچہ چند سال کا ہو جاتا ہے تو غریب سے غریب والد بھی اس بات کا آرزومند ہوتا ہے کہ اس کا لختِ جگر کسی مدرسہ میں داخل ہو کر علم سے اپنی آنکھوں کو روشن کرے۔ وہ بچے کی تعلیم کی خاطر ہر ممکن قربانی کرتا ہے۔ وہ اپنے جگر گوشہ کو ہر قیمت پر زیورِ علم سے آراستہ کرنا چاہتا ہے خواہ اسے سکول کے اخراجات اپنا پیٹ کاٹ کر ہی مہیا کرنے پڑیں۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے کرتا ہے کہ آج کی دنیا میں علم کے بغیر کامیاب و کامران زندگی کا تصور بھی امیدِ موہوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ علم کی قدر ہر دور میں ہوتی چلی آئی ہے اور اہلِ علم لوگوں کو ہمیشہ سے قوم کے دیگر افراد کے مقابل پر ایک بلند اور معزز مقام حاصل رہا ہے لیکن موجودہ دور میں جبکہ انسان اپنے زورِ علم سے چاند اور ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے علم کی قدر اور بھی بڑھ گئی ہے کیونکہ ظلمت و جہالت کے بادل چھٹ جانے کے بعد آج ہر طرف علم و فن کا دور دورہ ہے اور دقیانوسیت کی بجائے روشن خیالی کے نئے دور کا آغاز ہو چکا ہے۔

ایک طالب علم جب کسی درسگاہ سے وابستہ ہوتا ہے تو اس کا اوّلین فرض تحصیلِ علم ہوتا ہے۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ انسان کو اپنے عزائم بلند رکھنے چاہئیں اور ان اعلیٰ و ارفع مقاصد کے حصول میں کوشاں رہنا چاہیئے جس کی خاطر خالقِ کائنات نے اسے اس دنیا میں بھیجا ہے۔ اس لحاظ سے ہم ایک طالب علم سے بجا طور پر یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ اسلام کی خاطر اپنی جان قربان کر کے اس پُرفتن دور میں اپنے خون سے شجرِ اسلام کی آبیاری کرے گا۔ ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ خدا کا نیک اور پارسا بندہ بن کر بھولے بھٹکے لوگوں کی راہنمائی کرے گا۔ پھر ہم ایک طالب علم سے اس بات کی بھی اُمید کر سکتے ہیں کہ وہ بڑا ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر یا ماہرِ فن بن کر ملک و قوم کی عزت و نیک نامی کا موجب بنے گا۔ پھر ہم بجا طور پر قوم کے نوجوانوں کو پیش آنے والے تمام مصائب و مشکلات کے مقابل پر سیسہ پیر ہو کر قوم کی عزت و ناموس کی حفاظت کی تلقین کریں گے۔ ہم ان سب خدمات کی توقع کر سکتے ہیں اور بجا طور پر کر سکتے ہیں کیونکہ قوم کی ناموری اور قومی امانت کا بوجھ بہرحال نوجوان طالب علموں کے کندھوں نے ہی اُٹھانا ہے لیکن جب تک ایک طالب علم حصولِ علم میں مصروف ہوتا ہے اس کا سب سے بڑا اور واحد مقصد حصولِ علم ہونا چاہیئے۔ اس کے خیالات میں سکون اور اطمینان ہونا چاہیئے تاکہ وہ پوری توجہ اور یکسوئی سے علم حاصل کر سکے۔ ایسے وقت میں خیالات میں انتشار سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہتر کام وہی ہوتا ہے جو اپنے وقت پر کیا جائے اس لیے اگرچہ ہم طلبا سے بہت بلند کارہائے نمایاں کی توقع رکھ سکتے ہیں لیکن زمانۂ طالب علمی میں اُن کے سامنے صرف ایک مقصد ہونا چاہیئے کہ انہوں نے علم حاصل کرنا ہے اور درجۂ کمال تک حاصل کرنا ہے۔ پھر یہ امر بھی قابلِ توجہ ہے کہ ایک مبتدی طالب علم اُس وقت تک کارہائے نمایاں سرانجام نہیں دے سکتا جب تک اس کا ذہن نورِ علم کی تابناک شعاعوں سے صیقل نہ ہو جائے۔

پس ہمارے لائحہ عمل کی سب سے اہم اور بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ دیگر بلند مقاصد کو ایک لحاظ سے وقتی طور پر نظرانداز

کرتے ہوئے اس مقصد کی طرف ہماری توجہ دلاتا ہے جو وقت کی مناسبت سے سب سے اہم اور ضروری ہے۔ طالب علم ہونے کی حیثیت سے ان کا سب سے بڑا فرض علم حاصل کرنا ہے۔ اسی کی طرف ہمیں لائحۂ عمل میں توجہ دلائی گئی ہے تاکہ ہم پوری یکسوئی سے علم حاصل کرنے میں منہمک رہیں۔ اور اگر ہم اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں تو یہ امر ہمارے لئے زندگی میں پیش آمدہ حالات میں کامیابی و کامرانی کی یقینی ضمانت ہوگا۔

علم کے فضائل اور فوائد کی ایک دنیا معترف ہے۔ یقیناً یہ امر شک و شبہ سے بالا ہے کہ علم ایک گنج بے بہا ہے علم فتح و ظفر کی کلید ہے جو انسان کے لئے زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کے دروازے کھولتی چلی جاتی ہے لیکن علم اپنے ٹھوس، یقینی اور مفید نتائج پیدا کرنے کے لحاظ سے عمل کا محتاج ہے عمل کے بغیر علم کی مثال ایک دیئے کی سی ہے جس میں ہر چیز موجود ہو لیکن اس کی بتی کو آگ نہ دکھائی گئی ہو۔ عمل کے بغیر علم ایک جامد پتھر کی حیثیت رکھتا ہے جو اگرچہ سخت، ٹھوس اور مضبوط بھی ہے لیکن بالکل بے فائدہ اور بیکار ہے۔ اسی طرح اگر ایک عالم شخص اپنے علوم سے فائدہ نہ اٹھائے اور ان علوم کے مطابق عمل نہ کرے تو اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایسی صورت میں اس کا علم لاحاصل ہوگا۔ اور پھر یہ امر بھی توجہ کے قابل ہے کہ علم میں اس وقت تک پختگی پیدا نہیں ہوتی جب تک عمل کے ذریعہ علم کو خوب اچھی طرح جانچا نہ جائے۔ پس کسی ٹھوس علم کے لئے عمل کا تصور ناگزیر ہے۔

ہماری یہ دنیا دار العمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو انسان کے لئے عمل کرنے کی جگہ بنایا ہے اور اس دنیا میں کئے گئے اعمال کی جزا اسکو اگلے جہان میں ملے گی۔ چنانچہ ہر انسان اس دنیا میں کچھ نہ کچھ اعمال کرتا ہے۔ اگر ہم انسانی اعمال کا تجزیہ کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ عمل صالح وہی ہوگا جو علم کامل پر مبنی ہوگا۔ بعینہٖ جس طرح عمل کے بغیر علم زیادہ مفید ثابت نہیں ہو سکتا بالکل اسی طرح صحیح اور ٹھوس علم کے بغیر نیک اور صالح اعمال کی توقع بھی بے کار ہے۔ علم و عمل دونوں آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ بالفاظِ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم و عمل دو پہیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جن پر انسانی زندگی کی گاڑی رواں دواں ہے۔ اگر کسی بھی پہیئے میں کوئی خرابی واقع ہو جائے یا اس کا وجود ہی سرے سے ختم ہو جائے تو یہ گاڑی اپنی منزل کی جانب رواں نہیں رہ سکتی۔ ایک خوشگوار اور کامیاب زندگی کے لیئے ضروری ہے کہ انسان میں ہر دو خوبیاں پائی جائیں اور وہ علم و عمل کے زیور سے آراستہ ہو۔

علم و عمل میں باہمی گہرا تعلق ہے۔ اس تعلق کا صحیح ادراک ترقی اور کامیابی کی ضمانت ہے۔ ہمارے لائحۂ عمل کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ صرف جداگانہ طور پر علم و عمل کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس باریک تعلق کی بھی وضاحت کی ہے۔ لائحۂ عمل میں طلباء کو یہ بتایا گیا ہے کہ علم کا حاصل کرنا ان کا سب سے اہم فرض ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ان کو عمل کے پہلو سے ہرگز ایک ساعت کے لئے بھی غافل نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ علم کے بعد عمل ہی کامیابی کی کلید ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی ؎ یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اس وضاحت کے ساتھ ہمارا لائحۂ عمل ہمارے سامنے کامیابی کا صحیح راستہ پیش کرتا ہے۔

ہمارا لائحۂ عمل کالج کے طلبہ کو مخاطب کرتا ہے اور اس میں انہی کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے لیکن اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں طلبہ کو ان کی اس زندگی سے بھی متعارف کرایا گیا ہے جو حصولِ علم کے زمانہ کے بعد شروع ہونے والی ہے۔ لائحۂ عمل میں "عمل" کا لفظ ایک طرف تو طلبہ کو یہ بتاتا ہے کہ ان کا علم حاصل کرنے سے یہ مقصد نہ ہو کہ ہم نے علم حاصل کر لیا ہے وبس۔ بلکہ علم کے ساتھ عمل کرنے کی نیت ہونی چاہیئے تاکہ وہ علم مفید اور بابرکت ثابت ہو سکے۔ تحصیلِ علم کے دوران بھی انہیں اس امر کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ وہ یہ علوم اسی لئے حاصل کر رہے ہیں کہ انہیں بعد ازاں عملی جامہ پہنا کر قوم و ملک کی خدمت کر سکیں۔ پھر عمل کا لفظ دوسری طرف طلباء کو اس دورِ عمل کی یاد دلاتا ہے جو ان کی تعلیم کے بعد شروع ہونے والا ہے۔ لائحۂ عمل حصولِ علم میں مصروف طلبہ کو یہ امر ذہن نشین کراتا ہے کہ علم حاصل کرنے کے بعد انہیں زندگی کے عملی میدان میں اترنا ہے اور یہ وہ زمانہ ہوگا جب عمل کے ذریعہ ان کو اپنے علوم کے جوہر دکھانے ہوں گے۔ پس طلبہ کو ابھی سے اس عملی زندگی کی تیاری کر لینی چاہیئے تاکہ جب عمل کا وقت آئے تو وہ بڑی خوشی اور نشاط کے ساتھ مصروفِ کار ہو جائیں اور اپنے فرائض اس خوش اسلوبی سے سرانجام دیں کہ فتح و نصرت اُن کے قدم چومے۔

الغرض ہمارا لائحۂ عمل ہر لحاظ سے مکمل اور جامع لائحۂ عمل ہے۔ اس میں طلباء کی زندگی کی حقیقی تصویر بیان کی گئی ہے۔ ان کی کامیابی اور فلاح کے ذرائع کا ذکر ہے۔ ان کے حقیقی منصب اور مقام کی وضاحت کے ساتھ ان کو فرائض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور پھر عملی زندگی کے تقاضات کے ذکر سے ان کے ذہنوں کو اس بات کے لئے تیار کیا گیا ہے تاکہ وہ رزمگاہِ زندگی میں ایک کامیاب زندگی بسر کر سکیں۔ وہ انقلاباتِ زمانہ کو دیکھ کر گھبرانے اور دل شکستہ ہو کر بیٹھ جانے کی بجائے جرأت و مردانگی سے اُن کا مقابلہ کر سکیں اور اپنے علم و عمل کے حسین امتزاج سے بلند اخلاق اور تہذیب و ثقافت کی ایسی روشن قندیلیں فروزاں کریں جن کی ظلمت پاش کرنوں سے عالم تاریک و تار بقعۂ نور بن جائے اور بھولی بھٹکی انسانیت اپنے خالقِ حقیقی کے آستانہ پر سجدہ ریز ہو جائے۔ **دعا** ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیں اس زمرۂ ابرار میں شامل ہونے کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین ⁂

- کسی کام کا قصد کرو یا کوئی فیصلہ کرنے بیٹھو تو پہلے اپنے خدا کو یاد کر لیا کرو۔
- دعا تمام عبادتوں کی کنجی ہے بلکہ دعا خود عبادت ہے۔
- جس وقت امیدوں کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں تو اس وقت دعا ہی سب سے بڑا سہارا ہے ⁂

(مرسلہ منیر الحق شاہد)

محمود احمد
سال دوم (فنون)

منگلا ڈیم — ایک عظیم منصوبہ

منگلا ڈیم دریائے جہلم پر منگلا کے مقام پر بن رہا ہے۔ منگلا بند کے منصوبہ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ تین سال قبل سندھ کے طاس کی ترقی کے بارے میں ایک فنڈ کے لئے ایک معاہدہ پر دستخط ہوئے۔ یہ معاہدہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ایک سمجھوتے کا نتیجہ تھا۔ معاہدہ کے مطابق دریائے سندھ کے طاس کا پانی دونوں ملکوں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ معاہدہ کے تحت یہ طے پایا تھا کہ ۸۰ کروڑ ڈالر کا ایک فنڈ قائم کیا جائے جس سے ان منصوبوں کے لئے رقم فراہم کی جائے جن کے ذریعہ معاہدہ کے تحت بھارت کو ملنے والے دریائی پانی کی بجائے پاکستان میں متبادل انتظام ہو سکے اور پاکستان کی اقتصادی ترقی میں مدد ملے۔

عالمی بنک کے زیر نگرانی اس فنڈ کے لئے ریاستہائے متحدہ برطانیہ، جرمنی، نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور کینیڈا رقم فراہم کر رہے ہیں۔ امریکہ کا حصہ ۸۹ کروڑ بیس لاکھ ڈالر ہے جو مجموعی رقم کا ۶۰ فیصدی ہے۔ منگلا بند کے اخراجات اس فنڈ کی رقم سے پورے کئے جا رہے ہیں۔ بند کی تعمیر کا ٹھیکہ سان فرانسسکو کی ایک کمپنی کو دیا گیا ہے جو کہ امریکی کمپنیوں کی ایک تنظیم ہے۔

منگلا بند کے منصوبہ پر جنوری ۱۹۶۲ء میں کام شروع ہوا تھا اور جولائی ۱۹۶۸ء تک اس منصوبہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچنا چاہیئے لیکن ساڑھے دس ہزار ملازمین جن میں سے دس ہزار ملازمین پاکستانی اور ۵۰۰ امریکی، برطانوی اور دوسرے ممالک کے باشندے شامل ہیں، ۱۹۶۷ء میں کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں گے۔ اس وقت تک ۷۳ فیصد کام مکمل ہو چکا ہے اور باقی کام دن رات ہو رہا ہے۔

اس وقت منگلا کا مقام ایک عجیب نظارہ پیش کر رہا ہے۔ یہاں ایک مکمل اور شاندار شہر وجود میں آ چکا ہے۔ ہزاروں انسان مشینوں کی مدد سے پہاڑیوں کو اڑانے کے لئے اور ڈیم پر کنکریٹ، مٹی اور ریت ڈالنے میں رات دن مصروف کار ہیں۔ ان بڑے بڑے انجنوں اور مشینوں کی آمد و رفت کے شور سے پیدا ہونے والی آواز جب پہاڑیوں سے ٹکراتی ہے تو ہر طرف گونج پیدا ہوتی ہے۔ یہاں پر دن کو سورج اور رات کو برقی قمقموں کے نیچے بلڈوزر، ٹرک، گاڑیاں اور دوسری مشینیں اپنے کام میں مصروف نظر آئیں گی۔ رات کو تیز روشنیاں تاریکی کو دن میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

یہاں تقریباً تمام کا تمام کام ان دیوہیکل مشینوں سے ہی لیا جاتا ہے ۔ ہر گاڑی میں وائرلیس سیٹ لگا ہوا ہے ۔ اگر کسی گاڑی کو راستے میں کوئی نقصان پہنچ جائے تو فوراً وائرلیس سیٹ سے ورکشاپ کو آگاہ کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ اسی وقت گاڑی کو درست کر دیا جاتا ہے ۔ یہاں بڑی عجیب و غریب قسم کی مشینیں دیکھنے میں آتی ہیں ۔ ایک مشین ہے کہ بلڈوزر کے ٹائر کو جو کہ منوں وزن رکھتا ہے صرف تین منٹ میں اتار کر نیا ٹائر چڑھا دیتی ہے ۔ ایک بلڈوزر ایک وقت میں ۵۰۰ فٹ مٹی اٹھا سکتا ہے ۔ اس میں ایک پیمانہ لگا ہوتا ہے جب بلڈوزر میں مٹی کا وزن ۵ سو فٹ کے برابر ہو جاتا ہے تو گھنٹی بجتی ہے اور ڈرائیور بلڈوزر کو سٹارٹ کر کے منزلِ مقصود کی طرف چل دیتا ہے ۔

اس تمام کام کی نگرانی پاکستانی، امریکی اور برطانوی انجینئر کر رہے ہیں ۔ منگلا بند کنکریٹ کی ٹھوس دیوار کا بند نہیں ہو گا بلکہ اس کے دونوں طرف کی دیواروں کے درمیان خلا کو مٹی بھر کر پُر کیا جا رہا ہے ۔ یہ ایک پیچیدہ عمل ہے اور اسی وجہ سے کنکریٹ کا ٹھوس بند بنانے کے مقابلہ میں زیادہ مشکل ہے ۔ منگلا بند کا پاور ہاؤس تین لاکھ کلو واٹ بجلی پیدا کرے گا اور آہستہ آہستہ اس بند سے پیدا ہونے والی برقی طاقت نو لاکھ کلو واٹ ہو جائے گی ۔ حال ہی میں پاور ہاؤس کے جنریٹر اور مشینری جاپان سے منگلا آ رہی ہے ۔ اور ہر ایک کام وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے ۔

منگلا بند گیارہ ہزار فٹ لمبا ہو گا اور تین سو چھتر فٹ اونچا ہو گا ۔ اس بند میں مٹی بھری جائے گی اور مٹی کا یہ بند دنیا میں سب سے اونچا ہو گا ۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو اس بند کو مزید پچاس فٹ اونچا کیا جا سکے گا ۔ اس بند کے لئے مٹی یہاں سے ہی حاصل کی جا رہی ہے ۔ یہ جھیل چالیس میل لمبی ہو گی، اس کا عرض بیس فٹ اور زیادہ سے زیادہ گہرائی ۳۹۴ فٹ ہو گی ۔ منگلا کے مقام پر بڑے بند کی تعمیر کے علاوہ حسب ذیل منصوبے بھی شامل ہیں :-

۱ ۔ منگلا کے مقام سے بارہ میل دور مشرق کی طرف ایک مقام ہے جس کو بارکس کہا جاتا ہے ایک چھ ہزار چار سو فٹ لمبا امدادی بند بنایا جا رہا ہے ۔ یہ بند نصف کے قریب مکمل ہو چکا ہے ۔ چونکہ یہ جگہ ڈیم سے نیچی تھی اور خطرہ تھا کہ کہیں یہاں سے پانی بہہ نہ جائے اس لیے یہ بند بنایا جا رہا ہے ۔ یہ بند بھی بہت بڑا بند ہے ۔

۲ ۔ پاور ہاؤس ۔ اس پاور ہاؤس کے لئے پانچ سرنگیں بنائی گئی ہیں اور ہر ایک سرنگ کی لمبائی بارہ سو فٹ اور قطر تیس فٹ ہو گا ۔ ان سرنگوں سے پانی اتنی تیزی سے چلے گا کہ پاور ہاؤس کے چرخاب چلنے لگیں گے اور تین لاکھ کلو واٹ بجلی پیدا ہو گی ۔

۳ ۔ تین میل لمبی نہر بجلی گھر کا خارج شدہ پانی پہلی نہر میں گرا دے گی ۔ یہ کام بھی بڑی تیزی سے ہو رہا ہے ۔

۴ ۔ وہ آبادیاں جہاں جھیل آ جائے گی انہیں اب دوسرے مقامات پر بسایا جا رہا ہے ۔ یہ بھی بہت بڑا کام ہے جو کہ واپڈا نے اپنے ذمہ لے رکھا ہے ۔ ۔۔۔ واپڈا نے میرپور کو ایک نئی جگہ پر جو کہ پرانے میرپور سے پانچ میل بالا غالہ کے قریب ہے بنایا جا رہا ہے اور اس کے علاوہ مزید چار مقامات پر دیہات کو بسایا جا رہا ہے ۔

اس کے علاوہ جہلم سے منگلا اور منگلا سے نئے میرپور ٹاؤن تک ریلوے لائن لائی جائے گی اور جھیل میں مچھلیاں پالی جائیں گی - اس میں کشتی رانی بھی ہو سکے گی۔

یہ منصوبہ ایک کثیر المقاصد منصوبہ ہے جسے بنیادی طور پر سندھ کے طاس کے معاہدہ کے تحت عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے - اس کا مقصد ترقیاتی کاموں کے لئے بجلی پیدا کرنا اور آبپاشی کا بدل مہیا کرنا ہوگا - اس سے سیلاب کی روک تھام میں بھی مدد ملے گی اور ملک میں بجلی سستی ہو جائے گی - اس طرح ملک ترقی کی راہ پر گامزن ہو جائے گا - !!

قرطبہ یونیورسٹی کا گریجویٹ محمد ابن ابی عامر شاہی محل کے سامنے بیٹھ کر لوگوں کی عرضیاں لکھا کرتا تھا - قاضی شہر نے اُس کی قابلیت سے متاثر ہو کر اُسے اپنے محکمہ میں ملازم رکھ لیا - کچھ عرصہ بعد خلیفہ الحکم کے نابالغ لڑکے عبدالرحمٰن اور ملکہ ستیدہ صبح کی جاگیر کا ناظم مقرر ہوا اور اس دیانت سے کام کیا کہ سات ماہ کے اندر جاگیر کی آمدنی دوگنی ہو گئی -

بادشاہ الحکم اور وزیر اعظم مصحفی اس کارکردگی سے اتنے خوش ہوئے کہ اُس کو شاہی ٹکسال کا معتمد مقرر کر دیا - ٹکسال ہاتھ میں ہونے کے سبب اُس نے لوگوں کو اتنا خوش کیا کہ معمولی آدمی سے لے کر بادشاہ تک اُس کے گُن گانے لگے - دشمنوں نے خیانت کا الزام لگا کر اس پر محتسب مقرر کرا دیا مگر حساب میں ایک پائی کی بھی بددیانتی اُس پر نہ پائی گئی - اس پر اُسے یہ اعزاز ملا کہ بیک بیک وقت اشبیلیہ اور لبلہ کا قاضی مقرر کر دیا گیا - پھر قرطبہ کا گورنر ہوا اور بالآخر منصور کے لقب سے تختِ شاہی پر متمکن ہوا -

اُس نے قرطبہ کی گورنری کا چارج لیتے ہی پولیس افسروں کو چیلنج دیا کہ جس کسی نے مجرموں کی سرپرستی کی اُسے عبرتناک سزا دی جائے گی - اُس کی اس سخت گیری سے سارا نظام درست ہو گیا اور اتنا امن و امان ہو گیا کہ لوگ دکانیں کھلی چھوڑ کر سو جاتے مگر کیا مجال کوئی چیز چوری ہو جائے - اُسی زمانہ میں اُس کے ایک عزیز لڑکے نے اپنے والد کی گورنری کے گھمنڈ میں ایک بچے کو بید سے مارا - ابن ابی عامر تک شکایت پہنچی - اُس نے بیٹے کو بھری عدالت میں بید مارنے کی سزا دی اور بید مارنے والے کو حکم دیا کہ خوب زور سے مارنا کہ اُسے اور دوسروں کو عبرت ہو - ناز و نعم میں پلا ہوا یہ نازک بچہ بیدوں کی سزا کب برداشت کر سکتا تھا - نتیجہ یہ ہوا کہ اُس نے باپ کے سامنے حکم کی پاداش میں جان دیدی - ابن ابی عامر نے حکم دیا کہ اِس کی نعش گھر پہنچا دو -

عدالت برخاست کر کے جب گھر پہنچا تو اپنے محبوب بچے کی نعش سے لپٹ کر خوب رویا اور اُس کی ماں سے معذرت کرتے ہوئے کہا " بیگم! میں باپ بعد میں ہوں اور قاضی پہلے - قاضی کی حیثیت سے انصاف کیا، باپ کی حیثیت سے رو رہا ہوں " اللہ اکبر! بچہ قربان کر دیا اور عدلِ اسلام پہ حرف نہ آنے دیا +

(مرسلہ :- عنایت اللہ منگلا متعلم ایم - اے اکنامکس پنجاب یونیورسٹی لاہور)

ھدایت اللہ ھادی

تقلید اور فطرتِ انسانی

جب انسان کے سامنے کوئی متعین راہ نہیں ہوتی جو اُسے اس کی منزل تک پہنچا سکے تو عموماً منزل کا تصور بھی موہوم ہوجاتا ہے۔ اور جب منزل کا تصور موہوم ہوجائے یا کسی منزل تک جانے کے لیے کوئی راستہ نظر نہ آئے تو انسانی ذہن . . . بے راہرو ہوجاتا ہے، روزمرہ زندگی کے مسائل اُلجھ جاتے ہیں، انسان زندگی کے حقائق سے بیگانہ ہوجاتا ہے اور اس مقام پر پہنچ کر . . . . معاشرے کی صحتمند اقدار مجروح ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ اور یہی حال آج سے چودہ سو سال پہلے انسانی معاشرے کا تھا۔ اگر انسان کا ذہن خود اپنے لیے کوئی صحتمند ضابطۂ حیات تیار کر سکتا، اگر انسان میں اپنی زندگی کی راہ آپ متعین کرنے کی صلاحیت ہوتی اور اگر وہ اپنے روگ کے علاج کے لیے کسی مسیحا کا محتاج نہ ہوتا . . . . . انسانی زندگی کا راستہ متعین کرنے کے لیے قرآن پاک کبھی نہ اُترتا۔

انسان کو فطرتاً تقلید کی ضرورت ہے اور انسان ہر دور میں تقلید کا محتاج رہا ہے اسی لیے مختلف ادوار میں فطرتِ انسانی کو سمجھتے ہوئے قدرت نے انسان کو تاریکی سے نکالنے کے لیے وہ منزل دکھائی جسے وہ بھلا چکا تھا۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے وہ راہ دکھائی جو اُس کے وہم و گمان میں نہ تھی، اور پھر . . . . انسان کو اس راہ کی تقلید کرکے صحتمند معاشرہ قائم کرنے کی دعوت دی۔

انسان فطرتِ صحیحہ پر پیدا ہوتا ہے مگر اس کی "احسن تقویم" فطرت ماحول کے اثرات کی وجہ سے زنگ آلود ہوجاتی ہے، اس فطرت کو پھر صیقل کرنے کے لیے آسمان سے ہدایت کا ظہور ہوتا ہے۔ جو انسان اس سرچشمۂ نور کی تقلید کرتے ہیں وہ منزلِ ہستی کے سراغ کو پا جاتے ہیں۔

اگر انسان کے سامنے چلنے کے لیے کوئی راستہ نہ ہو تو اُس کے قدم جہاں سے اُٹھتے ہیں پھر وہیں آگرتے ہیں۔ اس کے ذہن میں منزل کا کوئی تصور نہ ہو تو وہ زندگی کو ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ موجودہ دور میں جو انسان نے سائنسی ترقی کی ہے اگر اس کے پس پردہ محرکات کا نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو ایک بات واضح ہوجاتی ہے کہ بنیادی طور پر انسان کے ذہن میں تقلید کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ سالہا سال پہلے پرندوں کی قوتِ پرواز نے جب انسانی ذہن کو متاثر کیا تو اُسے بھی ان کی تقلید کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس نے بھی ان پرندوں کی طرح فضا میں اُڑنا چاہا۔ چنانچہ شروع شروع میں اُس نے بازوؤں کے ساتھ "چھاج" باندھ کر فضا کی بلندیوں میں پرواز کرنے کی سعی کی۔ اس کے بعد ہوتے ہوتے جب قدرت کے دوسرے

قوانین کی تقلید کرتے کرتے وہ اپنے علم میں اضافہ کرتا گیا، ارتقاء کی منازل طے کرتا گیا اور اس کے ذہن کی قوتیں جب دورانِ تقلید عمل پیرا ہوئیں تو اُس نے پُرانی راہوں میں سے نئی اور جدید راہوں کو تلاش کیا حتیٰ کہ وہ .... پرندوں کی قوتِ پرواز کا منہ چڑانے کے لئے ہوائی جہاز لیکر میدان میں اُتر آیا۔ اور آج انسان میزائل اور راکٹوں کے ذریعے چاند کو بھی اپنی آماجگاہ بنانے والا ہے اور پچھلے دنوں اسے اپنے مقصد میں ایک عظیم کامیابی بھی حاصل ہوئی ہے جس پر موجودہ دور کا انسان .... بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

اگر ہم دیانتداری سے انسانیت کے مقام پر غور کریں تو دراصل انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات اُسی وقت ثابت کر سکتا ہے جب وہ مظاہرِ قدرت کی تسخیر پر کمربستہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمانوں کے اجرام غرض تمام عناصر کو اپنے حکم سے انسان کے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے۔ ان عناصر کی تسخیر بھی اُس کے اعلیٰ مقاصد میں شامل ہے بلکہ اُس کی زندگی کی علامت ہے۔ آج جبکہ انسان کی پرواز فضا کو چیرتی ہوئی صرف چاند تک ہی نہیں پہنچی بلکہ اس نے سمندر کی تہوں کو بھی گھنگالا ڈالا ہے۔ مچھلی کو سمندر میں تیرتا دیکھ کر انسان نے پہلے اس کی ساخت کا مطالعہ کیا اور پھر اُس کی تقلید میں آبدوز کشتیاں بنا کر انسان کو زیرِ آب سانس لینا سکھایا اور یہی دراصل انسان کا صحیح مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان حقیقت میں انسانیت کی بلندیوں کو چھوتا ہے ـــــ اگرچہ تقلید کا جذبہ فطرتِ انسانی میں داخل ہے مگر پھر بھی تقلید ہر صورت میں مفید نہیں ہو سکتی۔ تقلید انسان کو زندگی کی اعلیٰ اقدار سے بھی روشناس کرا سکتی ہے اور اسے قعرِ مذلت میں گرانے کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ تقلید کے ان دونوں پہلوؤں کا انحصار .... مقلّد کے ذہنی جھکاؤ پر ہے۔

کورانہ تقلید یعنی اندھا دھند تقلید کی جسے عُرفِ عام میں بھیڑ چال کہتے ہیں قرآن کریم نے مذمّت فرمائی کہ اندھوں اور بہروں کی طرح پیش کردہ امور کی تقلید شروع نہ کرو بلکہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔ اِسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ تقلید کیلئے صحیح راہ کے تعین میں ذہنی آزادی کو بہت دخل ہے۔ غلام ذہن تقلید کے لئے جو راہ انتخاب کرتا ہے وہ اسے انسانیت کے مقام سے گرا دیتا ہے لیکن آزاد ذہن کا انتخاب اسے انسانیت کی بلندیوں سے روشناس کراتا ہے۔ اور جنّت سے نکلے ہوئے اس معمولی سے آدمی کو ستاروں کی دنیا کا حاکم بنا دیتا ہے۔

سائنسی ترقی، بین الاقوامی سیاست، معاشرتی اقدار اور اخلاقیات، غرضیکہ زندگی کے ہر میدان میں انسان کچھ متعیّن اصولوں اور قوانین کی تقلید اور پیروی کرتا ہے کیونکہ قدرت کا منشاء ..... انسان کا ارتقاء ہے۔ اس لیے صحت مند اصول کی تقلید ..... انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور انسانی ترقی کے لئے تازیانہ۔ اب قیامت تک انسانیت کی روحانی، مادی، اخلاقی، اور معاشرتی، غرض ہر بہت سے ترقی کے لئے قرآن بہترین ضابطۂ حیات ہے جس کی تقلید ابدی فلاح و فوز کی کلید ہے!

گلہائے رنگا رنگ

- زرتشت منیر احمد خان
- منوّر احمد قاسم
- محمد اسلم شاد
- بشارت نذیر
- لطف الرحمٰن محمود
- محمود احمد ونیس
- انعام اللہ ہاشمی
- عبدالشکور اظہر
- نثار احمد بسرا

زرتشت منیر احمد خان

اِن سے ملیئے

(اس مضمون کے مندرجات اگر کسی صاحب پر منطبق ہوں تو یہ محض ایک اتفاق ہوگا اس کیلئے مضمون نگار ہرگز ذمہ دار نہیں)

جی ہاں ـــــ میں آپ کے اور ان کے درمیان زیادہ دیر تک حائل ہونا نہیں چاہتا۔ ان سے میرا تعارف چند دن پیشتر ہی ہوا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ میں ان کی ذاتِ والا صفات پر پوری روشنی نہ ڈال سکوں۔ بہرحال اپنے علم کے مطابق عمدہ رنگ میں آپ کا ان سے تعارف کراؤں گا لیکن یہ شرط بھی پیش کروں گا کہ اگر ان سے آپ کی رفاقت دیرپا ثابت ہوئی تو نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہوں گے ـــــ اے لیجئے ـــــ وہ آ رہے ہیں۔

ان سے ملیئے ـــــ یہ ہیں مسٹر چوہدری ـــــ آپ ماشاء اللہ فرسٹ ایئر کے طالب علم ہیں۔ ذرا ان کی شکل ملاحظہ کیجئے ـــــ میانہ قد، بھرا بھرا سا جسم، کتابی چہرہ، سفید رنگ، ستواں ناک اور غلافی آنکھیں، اس پر سیاہ چست پتلون اور ٹی شرٹ زیب تن کئے آپ سو فیصد غیر ممالک کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ پولیس کے کسی چاک و چوبند سپاہی کی طرح کالج کے برآمدوں میں گشت کرتے رہتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ـــــ اور یہ دو کنارے کبھی آپس میں مل نہیں سکتے لیکن آپ کی ذات مشرق و مغرب کا ایک حسین امتزاج ہے۔ ٹائی اور چست لباس کے ساتھ آپ کی مسیح داڑھی اور پنجاب کی روایتی دیسی جوتی یوں معلوم دیتے ہیں گویا آپ کے اوپر مغرب سوار ہے اور آپ بذاتِ خود مشرق پر سوار ہیں ـــــ چوہدری صاحب کو سگریٹ سے سخت نفرت ہے مگر دیسی حقے سے ان کی وابستگی دو تین نسلیں پرانی ہے کیونکہ آج کل ہر ایرا غیرا سگریٹ پی رہا ہے۔ !! غالب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ غالب نے اسد تخلص محض اس وجہ سے چھوڑ دیا تھا کہ ایک عام آدمی کا تخلص بھی اسد تھا۔ !!

آپ کا خیال ہے کہ ہماری قومی ترقی چست لباس میں مضمر ہے۔ آپ کی رائے میں لباس بدن سے چپکا ہونے کی وجہ سے چستی و توانائی برقرار رکھتا ہے۔ یہ کھلے پائنچوں والی شلواریں اور ڈھیلی ڈھالی پتلونیں ـــــ! یہ تو ایک مصیبت ہیں۔ جس کے نہ سر ہیں اور نہ پیر ـــــ کم بخت گھسٹتے جا رہے ہیں ـــــ سائیکل میں پھنس رہے ہیں ـــــ رات دن خدمت لی جا رہی ہے ـــــ آپ کے خیال میں ہماری اقتصادی بدحالی کی واحد وجہ کپڑے کا ضیاع ہے۔ چنانچہ آپ کی رائے میں ایک پتلون کے لئے بارہ چودہ گرہ کپڑا کافی ہے اور اس طرح سے ہمارے ملک کی اقتصادی حالت بھی سدھر جائیگی۔

ہر سٹوڈنٹ جو تازہ تازہ میڈیکل کے مضامین لیتا ہے وہ ضرورت سے زیادہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا حامی اور مبلغ بن جاتا ہے۔ یہی حال ہمارے چوہدری صاحب کا ہے بلکہ اس معاملہ میں آپ دوسروں سے زیادہ بدحال ہیں۔ اس مسئلہ پر گفتگو کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ چنانچہ کسی ریستوران میں بیٹھے ہوئے نتھو دھوبی سے اس نظریہ پر زوردار بحث کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ آپ کے خیال میں جاندار عناصر کے علاوہ بے جان اشیاء میں بھی ارتقاء ہوتا ہے چنانچہ تخفیفِ لباس کو آپ ارتقاء ہی کی ایک دلیل قرار دیتے ہیں۔ اکثر آپ کی زبانِ مبارک پر یہ شعر جاری رہتا ہے ؎

ڈارون بولا کہ بوزنا ہوں میں
غلط کہتا تھا بوزنا ہوں میں

آپ اکثر اوقات فزکس لیبارٹری اور کیمسٹری لیبارٹری کے درمیانی فاصلہ کی قدموں کے ذریعہ پیمائش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں یا کسی کو بات سمجھاتے ہوئے ہاتھوں کے مختلف زاویے بناتے نظر آئیں گے۔ کرکٹ کے کھیل کا چونکہ فزکس کی پیمائشوں سے خاص تعلق ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میڈیکل اور نان میڈیکل کے بیشتر طلباء اس کھیل کے شائق ہوتے ہیں لہذا آپ ایک اعلیٰ پایہ کے کرکٹر بھی ہیں۔ سنا گیا ہے کہ ایم سی سی کی گراؤنڈ ٹھیک ہونے کے بعد ۷۲ء میں پاکستان کی جو ٹیم انگلستان کھیلنے کے لئے جائے گی وہ آپ ہی کی سرکردگی میں تیار ہو رہی ہے تاکہ پھر وہاں حسبِ معمول بولنگ سے گڑھے ڈال سکے!! - باوثوق ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ماضی قریب میں آپنے ایم سی سی کو "میرو ڈبہ" کھیلنے کا چیلنج بھی دیا تھا جس کا تا حال کوئی جواب موصول نہیں ہوا اور نہ ہی امید ہے۔ اس کے بعد غالباً آپ "میرو ڈبہ" کا عالمی چیمپئن قرار دیا جائیگا۔
سائنس کے مضامین کافی محنت طلب ہوتے ہیں میٹرک تو آپنے گھوٹا لگا کر پاس کر لیا لیکن اب کالج میں آ کر کافی مشکلات کا سامنا ہے۔ اکثر کہہ اٹھتے ہیں ؎

جانتا ہوں فوائدِ گھوٹا
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

اس کا علاج آپ نے جلد ہی دریافت کر لیا۔ مجھے ایک خط کے ذریعے غالب کی روح سے معذرت کرتے ہوئے انہوں نے اطلاع دی ہے ؎

ہم نے ان موٹی کتابوں کا نکالا ہے علاج !
نوٹ لے کر اس قدر رگڑیں کہ آساں ہو گئیں

شعر و شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ جدت پسندی کے حامی ہیں۔ آزاد شاعری کو آپ نے ایک نئے تصور سے روشناس کرایا ہے۔ آپ کی آزاد نظم کے چند اشعار سنیئے اور داد بے داد دیجئے ؎

اے حسن بے بہاراں - !

تیری چیخوں کا ترنم! تیری سسکیوں کی لَے!
اور مَیں تیرے جسم کے ٹکڑے ہوتے دیکھ کر مسرت سے جھوم اُٹھا!

—— لیجیے وہ ایک اور صاحب نظر آ گئے۔ آپ پُرانے تجربہ کار معلوم ہوتے ہیں۔ الیکشن لڑتے بھی ہیں اور لڑاتے بھی ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو، بڑے لڑانا خاندانی پیشہ ہے۔ ؏

"سَو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری"

اکثر الیکشن ہار جاتے ہیں مگر آپ نے کبھی ہمت نہیں ہاری بلکہ ہر حال تازہ دم ہو کر خادمِ خلق کی حیثیت میں یہ نعرہ لگاتے ہوئے میدانِ الیکشن میں کود پڑتے ہیں ؎

گرتے ہیں سائیکلسٹ ہی میدان و سڑک پر
وہ طفل کیا کرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے

ڈاکٹر جانسن کا قول ہے کہ "ہمت اور فتح لازم و ملزوم ہیں" لیکن الیکشن جیتنے کے بارے میں آپ نے یہ کلیہ پیش کیا ہے کہ "الیکشن میں فتح اور رجائیت لازم و ملزوم ہیں" —— گو ہم نے اس کلیہ کو درست پایا ہے لیکن آج تک یہ سمجھ نہیں پائے کہ آخر آپ کیوں کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتے ——!

قدیم یونان میں ایک فلاسفر دوپہر کے وقت ہاتھ میں چراغ لیے گلیوں میں کچھ تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ تم کیا تلاش کر رہے ہو؟ تو اُس نے جواب دیا —— "انسان" —— عقیدت مندوں کے جھرمٹ میں یہ صاحب بھی ہاتھ میں چائے کی پیالی تھامے ٹک شاپ کے گرد و نواح میں کچھ تلاش کرتے نظر آئیں گے۔ اگر آپ ان سے پوچھیں کہ "صاحب! آپ کیا تلاش فرما رہے ہیں؟" —— تو کہیں گے —— "ووٹ" ——

تیسرے صاحب ہمارے کالج کے پُرانے بزرگوں میں سے ہیں۔ کافی بھاری بھرکم ہیں۔ گویا ان کا "حدودِ اربعہ" کافی وسیع ہے۔ ان کا نام تو مجھے معلوم نہیں البتہ عوام الناس نے انہیں "سینئرو" کی اعزازی ڈگری دے رکھی ہے۔ جن دنوں میں فرسٹ ایر میں تھا تو یہ فورتھ ایر میں تھے اور جب مَیں نے فورتھ ایر پاس کیا تو یہ فورتھ ایر ہی میں تھے۔ اب جبکہ میں فرسٹ ایر کو پڑھا رہا ہوں یہ ہنوز فورتھ ایر میں ہیں ممکن ہے ہمیشہ فورتھ ایر ہی میں رہیں انشاءاللہ۔

دراصل بعض لوگ محفل کی جان ہوتے ہیں اور بعض محفل کی موت۔ آپ کا وجود مؤخرالذکر گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ان لوگوں کی پیشانی پر عالمِ برزخ کا نشان ثبت ہوتا ہے اور ان کا نظر آنا کسی ابتلاء یا مصیبت کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آپ پر نظر پڑتے ہی دوست لاحول کا وِرد کرتے ہیں اور اچھی خاصی محفل "جل تو جلال تو آئی بلا

کوٹال ٹو"۔۔۔ زیرِ لب پڑھتے ہوئے منتشر ہو جاتی ہے۔

میرا ان سے تعارف ایک تلخ اور ناخوشگوار رہا ہے۔ یہ اُن ایام کی بات ہے جبکہ یونین کے عہدیدار ہونے کی وجہ سے Debate پر اجازت نامے تقسیم کرنے کا تلخ فرض ہمیں تفویض کیا گیا تھا۔ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر شام کے دھندلکے میں یونین آفس سے باہر نکلے تو ایک کافی طویل و عریض بلا نظر آئی۔ ابھی یہ تسلی کرنے کے لئے آنکھیں جھپک ہی رہی تھیں کہ آیا یہ کوئی انسان ہے یا آسمان سے نازل ہونے والی عجیب الخلقت بلا ۔۔۔ اقبل اس کے کہ میں کچھ اندازہ کر سکتا انہوں نے "ہاؤ" کا ایک فلک شگاف نعرہ بلند کرتے ہوئے مجھے چمٹا لیا۔ وہ تو خیر ہوئی انکی توند کچھ نرم تھی ورنہ میری چند عدد پسلیاں ضرور شہید ہو جاتیں۔ جان بخشی کرتے ہی فرمانے لگے ۔۔۔ "ارے بہت دنوں کے بعد ملے ہو۔ اب تو تمہیں نہیں چھوڑیں گے ۔۔۔ آؤ ٹک شاپ میں چل کر چائے پیئیں ۔۔۔" وہ ایک ہی سانس میں نجانے کیا کچھ کہہ گئے۔ میں فطرتاً کچھ کم گو واقع ہوا ہوں اور بات کرتے ہوئے حتی الوسع احتیاط کا پہلو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان سے کہوں کہ ۔۔۔ "حضرت! آپ کون صاحب ہیں اور یہ مجھ پر عقیدت و محبت کے اس قدر پھول کیوں نچھاور کر رہے ہیں" ۔۔۔

ان کا سلسلۂ کلام کچھ اس تواتر سے جاری ہوا کہ عرض کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ وہ کیا کیا فرماتے رہے کیونکہ میں بالکل حواس باختہ ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ فرسٹ ایئر کے طلبہ عموماً سینئر طلبہ سے خائف ہی رہتے ہیں۔ اسی اثنا میں وہ میرے ہاتھ پکڑے ہوئے ٹک شاپ میں داخل ہو چکے تھے۔ یہاں پہنچتے ہی انہوں نے "چائے بمعہ لوازمات" کا آرڈر دے دیا۔ میں نے چاہا کہ عرض کروں "صاحب! چائے کا یہ کون سا وقت ہے" ۔۔۔ لیکن انکی ہیبت پر نظر پڑتے ہی لرز کر رہ گیا۔ دل میں بہت سوچا کہ عرض کروں ۔۔۔ "حضرت! معاف فرمائیے گا۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے" ۔۔۔ لیکن چائے وغیرہ کا "ایثار" دیکھ کر میں نے ان کا دل توڑنا مناسب خیال نہ کیا۔ بہرحال بہت جرأت کر کے میں نے ان سے کہا ۔۔۔ "جناب کا اسمِ گرامی" ۔۔۔

اس پر وہ نہایت غضبناک نگاہ ڈالتے ہوئے ایک دم سے بولے ۔۔۔ "ارے! تم مجھے نہیں پہچانتے، ضلع سیالکوٹ میں میرا گاؤں تمہارے گاؤں کے ساتھ ہے اور ہاں ۔۔۔! الیکشن میں ہم نے تمہیں Support کیا تھا" ۔۔۔

میں نے سوچا کہ ان سے کہوں کہ "صاحب! مجھے تو علم نہیں کہ آپ نے الیکشن میں میری مدد کی ہو۔ میں نے تو کالج کے احاطہ میں آج پہلے دن آپ کی زیارت کی ہے" ۔۔۔ لیکن یہ جسارت نہ کر سکا۔ بہرحال انہوں نے جلد ہی اپنا عندیہ بیان کرتے ہوئے میری حالت پر رحم فرمایا اور یوں گویا ہوئے ۔۔۔ "دراصل بات یہ ہے کہ مجھے چند دوستوں کے لئے تین اجازت نامے درکار ہیں" ۔۔۔ میں نے اس موقع کو غنیمت خیال کرتے ہوئے جلدی سے تین عدد اجازت نامے

ان کے حوالے کئے اور وہاں سے کچھ اِس طرح بھاگا کہ پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی۔ غرض اس قدر وحشت طاری تھی کہ اندھیرے میں کچھ سُجھائی نہ دیتا تھا۔ ایک چھوٹی سی دیوار سامنے آئی تو اُس پر ہی چڑھ گیا۔ ایک چھوٹی سی اینٹ پر پاؤں رکھ کر دوسری جانب اُترنے کی جو کوشش کی تو پاؤں پھسل گیا اور مَیں اوندھے مُنہ زمین پر گرا۔ چھ سات فٹ تک لڑھکتا چلا گیا۔ سارا بدن اور کپڑے مٹی سے اَٹ گئے اور پتلون کا تو بالکل ستیاناس ہوگیا۔ کچھ سنگریزے بازوؤں اور گھٹنوں میں لگنے کی وجہ سے خون نکل آیا اور ٹھوڑی میں کافی گہرا زخم ہوگیا۔ چنانچہ اگلے دن دورانِ مباحثہ یہ بندۂ عاصی اسی حالت میں اسٹیج پر براجمان تھا کہ سارے بدن پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ باقی زخم تو جلد ہی مندمل ہوگئے لیکن ٹھوڑی پر زخم کا نشان آج بھی موجود ہے ——

غرض وہ دن اور آج کا دن —— مَیں نے قسم کھالی ہے کہ جہاں کہیں یہ صاحب نظر آئیں تو مَیں فوراً راہِ فرار اختیار کرلوں —— اے لیجئے —— وہ تشریف لا رہے ہیں —— اچھا جناب! اب جلدی سے اجازت دیجئے ورنہ قسم ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے —— !!

ایک بے ضرر خط

"چچا جان! تسلیم

آپ کا خط ملا۔ جو میرے اُس خط کے جواب میں تھا جو مَیں نے آپ کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ خط پڑھ کر یہ تسلی ہوئی کہ آپ اُسی گھر میں رہتے ہیں جس میں پہلے رہتے تھے۔ باقی یہ کہ آپ کی بھینس نے جو بچّہ دیا ہے یہ اُس نے اچھا ہی کیا ہے۔ بھینس کا یہ فعل مجھے بے حد پسند آیا ہے۔ میری طرف سے بھینس کو نمستے۔ بھینس کے علاوہ چھوٹی مُنّی، بڑے مُنّے اور منجھلی لڑکی کو پیار۔ بچی جان اور ان کی سہیلیوں کو سلام۔ مَیں یہاں خوش ہوں آپ وہاں خوش ہیں۔ اِس سے زیادہ ہم کو اور کیا چاہیئے؟ خط کا جواب جلدی دیں۔ اگر مصروفیت ہو تو مصروفیت ختم ہونے کے بعد دیدیں۔

آپ کا ہی بھتیجا

"کرشن"

تمباکو نوشی کس طرح چھوڑیں؟

مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے عمل دخل سے پاکستان میں بھی سقوطِ قلب (دل کی حرکت کا بند ہونا) اور سرطان کی وارداتیں برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔ پچھلے سال پاکستان کے تقریباً تمام بڑے آدمی سقوطِ قلب اور سرطان سے فوت ہوئے ہیں۔ آج کل موت اور دائمی علالت کا سگریٹ نوشی سے براہِ راست تعلق ہے۔ یہ چند صدیوں کی تمباکو نوشی کا نتیجہ ہے اور مزید چند صدیوں تک یہ عادت جاری رہی تو نہیں کہا جا سکتا کہ انسانی صحت اور اس کی تہذیب کا کیا انجام ہوگا!

یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے کہ تمباکو کے دھوئیں کی کالک سے سرطان (کینسر) پیدا ہوتا ہے لیکن دل کے لئے تمباکو کا دھواں اس سے بھی زیادہ مضر ہے۔ انگلستان میں ہر سال پچیس ہزار انسان پھیپھڑوں کے سرطان سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ تمباکو کا زہر جسم پر آہستہ آہستہ اثر ڈالتا ہے۔ تمباکو کے اثر سے سرطان کے لئے مستعد ہونے میں تقریباً بیس سال کا عرصہ لگ جاتا ہے اور تمباکو نوش اس سے پہلے دل اور خون کی رگوں میں مبتلا ہو کر لقمۂ اجل ہو جاتا ہے۔

یہ ایک سنگین صورتِ حال ہے جس کو کسی صورت سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کے تدارک میں کسی قسم کی غفلت سخت خطرناک ہوگی۔ تمباکو نوشی کا تدارک افیون اور شراب نوشی ترک کرنے کی طرح مشکل نہیں ہے۔ آپ محض قوتِ ارادی کو کام میں لا کر نکوٹین کے دامِ تزویر سے رہائی حاصل کر سکتے ہیں۔ صرف تین یا زیادہ سے زیادہ پانچ دن تک طبیعت پر جبر کر لیجئے اس کے بعد تمباکو کی طلب خود بخود جاتی رہتی ہے یا اس قدر کمزور ہو جاتی ہے کہ طبیعت پر زیادہ جبر نہیں کرنا پڑتا۔ اگر تمباکو کے نقصانات کا آپ کو یقین آ جائے تو یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ تمباکو نوشی رفتہ رفتہ کم کرنے میں بہت کم لوگوں کو کامیابی ہوتی ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ آپ اسے ایک دم چھوڑ دیں۔ جو لوگ روزے رکھتے ہیں ان کے لئے رمضان شریف کے مہینے میں تمباکو کی بلا سے نجات حاصل کر لینا بہت آسان ہوگا۔ پختہ ارادہ کر کے چھوڑ دیجئے۔ آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔

تمباکو چھوڑنے کے بعد مناسب ہوگا کہ آپ دن میں دو تین مرتبہ گرم پانی سے غسل کر لیا کریں۔ جس وقت تمباکو نوشی کا مطالبہ شدید ہو آپ گرم پانی سے غسل کر ڈالئے۔ پانی خوب پیجئے۔ پانی کا بہتر وقت دو کھانوں کے درمیان کا وقت ہے نکوٹین جس قدر آپ کے جسم کے رگ و پے سے بہہ کر نکل جائے اچھا ہے۔ پانچ یوم خوب جی بھر کر سوئیے معین اوقات پر کھانا کھائیے اور جلد سو جائیے۔ شب کے تفریحی مشاغل کو بالکل قطع کر دیجئے۔ آپ کو اس زمانے میں توانائی کو محفوظ

رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

کھانا کھانے کے بعد تمباکو نوشی کی طلب شدید ہوتی ہے لہذا کھانا کھانے کے بعد کرسی یا بستر پر آرام نہ کیجئے بلکہ باہر چہل قدمی کے لئے نکل جائیے۔

تمباکو ترک کرنے کی کوشش میں شراب، چائے، کافی اور کولا وغیرہ مشروبات سے ہرگز مدد نہ لیجئے۔ نہ محرکات استعمال کیجئے اور نہ مسکنات۔ اس سے یہ غرض ہے کہ آپ کے اعصاب بہت جلد تندرست و توانا ہو جائیں۔ ایک بلا کو چھوڑ کر دوسری میں گرفتار ہو جانا کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے۔ غذا سادہ اور صحت بخش کھائیے۔ گوشت اور شیرینی کی بجائے زیادہ تر پھلوں اور ترکاریوں پر اکتفا کیجئے۔ گرم دودھ استعمال کر سکتے ہیں۔ تیز مصالحہ دار یا بھنی ہوئی اشیاء بالکل نہ کھائیے۔ زیادہ مقوی اور ثقیل غذا بھی تمباکو نوشی کے مطالبے کو بڑھا دیتی ہے۔ تمباکو نوشی ترک کرنے سے عارضی طور پر تفخ ہونے لگتا ہے یا قبض ہو جاتا ہے اس لیئے چند روز تک پھلوں اور ترکاریوں پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا۔ اس غذا سے نہ پیٹ پھولے گا اور نہ قبض ہونے پائے گا۔

مزید قوت کی بہم رسانی کے لئے حیاتین ب مرکب کا استعمال مناسب ہوگا اور سب سے بڑھ کر صبر اور صلوٰۃ کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگیئے اور اپنی اس کوشش میں خدا کو اپنا رفیق بنا لیجئے آپ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ اگر چند آدمی مل کر تمباکو نوشی ترک کرنے کا ارادہ کر لیں تو زیادہ کامیابی ہوتی ہے اور ایک دوسرے کی شرم و لحاظ کی وجہ سے کمزوری غلبہ نہیں کر پاتی اور دوسروں کی رفاقت کی وجہ سے ہمت بندھی رہتی ہے۔

جس وقت تمباکو کی طلب غلبہ کرے تین چار منٹ تک لمبے لمبے سانس لیجئے، طلب جاتی رہے گی ورنہ گرم پانی سے غسل کر ڈالیئے یا گرم دودھ میں تھوڑا سا شہد ڈال کر پی جائیے۔

اگر آپ نے اس پروگرام پر عمل کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ کو تمباکو کی غلامی سے نجات نہ مل جائے۔

ایک دعوت میں ایک وزیر اور اس کی وزارت کے سیکرٹری کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ سیکرٹری نے وزیر کو گالیاں دیں اور کہا آپ گدھے ہیں، احمق ہیں، بے وقوف ہیں۔

دعوت ختم ہونے کے بعد جب سیکرٹری گھر پہنچا تو وہاں ایک سپاہی اس کی گرفتاری کا وارنٹ لئے کھڑا تھا۔ سیکرٹری نے پوچھا "مگر میرے خلاف الزام کیا ہے؟"

سپاہی نے جواب دیا:۔

"سرکاری راز افشا کرنے کا الزام"

خشتِ اوّل

المنار نہ "ادبی دنیا" ہے اور نہ اِسے "ادبی دنیا" بنانا مقصود ہے بلکہ المنار تعلیم الاسلام کالج کے طلباء کا ترجمان ہے جس میں لکھنے کا اوّلین حق طلباء کا ہے۔ فن خواہ کوئی ہو اُس میں کمال آہستہ آہستہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ حصولِ کمال کے لئے جدّوجہد مسلسل ایک لازمی امر ہے لیکن مناسب حوصلہ افزائی اور قدردانی کے بغیر سعیٔ پیہم کا تصوّر بھی قریباً ناممکن ہے۔ اِس اصول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے نئے لکھنے والوں کے مضامین کو بھی المنار میں جگہ دی جاتی ہے۔ ذیل کے تینؔ مضامین اگرچہ طلبہ کی پہلی کاوش کا ثمرہ ہیں لیکن ہم ان کی کامیاب کوشش پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعاگو ہیں کہ ؏

اللہ کرے زورِ قلم اَور زیادہ

(مدیرِ اعلیٰ)

منوّر احمد قاسم
سال اوّل (فنون)

"لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ....."

یہ وہ مقدّس الفاظ ہیں جو میرے محبوب آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے پیارے لبوں سے دشمنانِ اسلام کے لئے حیاتِ جاوداں کا پیغام لئے ہوئے نکلے اور تمام عالم کو محوِ حیرت کر دیا۔ تمام دشمنوں کو خدائے قدیر نے آپؐ کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ اگر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تو ایک ایک دشمن کو تڑپا تڑپا کر اپنے زخمی دل کی آگ ٹھنڈی کر سکتے تھے مگر خدا کے اس مطہّر و مقدّس، حلیم اور بُردبار وجود نے جسے اللہ تعالیٰ نے رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْن بنا کر بھیجا تھا ان سب دشمنوں کو بیک جنبشِ لب معاف فرما کر رہتی دنیا تک انسانیت کا سر بلند کر دیا۔ کیا آپؐ کے سینے میں دل نہ تھا؟ یا وہ دل درد آشنا نہ تھا؟ سب کچھ تھا ـــــ مگر خداوند تعالیٰ نے آپؐ کو ایک ماں سے زیادہ شفیق و مہربان بنایا تھا یہی وجہ تھی کہ آپؐ کا دل بنی نوعِ انسان کے لئے ہر دم گداز رہتا تھا۔ آپؐ کا وجود مجسّم رحمت اور شفقت تھا۔

سرزمینِ عرب میں محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کیا مظالم روا نہ رکھے گئے؟ کفار کے عزائم یہ تھے کہ اس شمعِ فروزاں کو چشمِ زدن میں گُل کر دیں لیکن وہ نُورِ رسالت جس کی پُشت پناہی خدائے قادر و توانا کر رہا ہو کفر کی ان پھونکوں سے کب مدھم پڑ سکتا تھا۔ محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کو انسانیت سوز مظالم کا تختۂ مشق بنایا گیا، سیّد المعصومین صلی اللہ علیہ وسلم پر جور و جفا کی وہ سختیاں وارد کی گئیں جن کے تصوّر سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ـــــ یہ سب کچھ ہوا ـــــ کفار نے ہر ممکن تکلیف دی لیکن محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت صبر و تحمل سے انہیں برداشت کیا ـــــ اور جب اُن جانی دشمنوں پر خدائے ذوالجلال نے حکومت و اقتدار بخشا تو عفو عام کا حکم دیکر اپنے رحمتِ دو عالم ہونے کا زندہ و تابندہ ثبوت پیش کر دیا۔

آج اہلِ مغرب اپنی تہذیب پر فخر کرتے ہیں اور مغرب نواز اس تہذیب کی مدح سرائی میں گم ہیں لیکن بلند اخلاقی کا جو معیار میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش فرمایا اس کے حقیقی تصوّر سے بھی دانایانِ فرنگ کی عقل و خرد قاصر ہے یہ بات ان کی سمجھ سے بالا ہے کہ کبھی اپنے جانی دشمنوں کو بھی معاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خدا کے بے انتہا درود و سلام ہوں محمّد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ـــــ جس نے عفو و درگزر کا ایسا نقید المثال نمونہ پیش فرما کر اپنوں اور غیروں سے اسلامی تعلیمات کی برتری و فضیلت کو تسلیم کروا لیا۔ اللّٰھم صلّ علیٰ محمّدٍ وبارک وسلّم انّک حمیدٌ مجیدٌ +

محمد اسلم رشاد
بی۔ اے سال اوّل (فنون)

یاد

صبح کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، سورج کی روپہلی کرنیں میرے سامنے اُگے ہوئے گلاب کے سُرخ پھول پر پڑ رہی تھیں۔ پھول کی پتیوں پہ شبنم کے چمکدار موتی عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی حسین سُرخ و سفید چہرہ چاند کی روشنی میں دمک رہا ہو۔ بادِ صبا کے دلفریب جھونکے میرے دل و دماغ کو معطر کر رہے تھے لیکن میں قدرت کے ان حسین نظاروں سے غافل دُور ـــــ بہت دُور خیالات کی پُرسکون وادی میں سرگرداں پھر رہا تھا۔ ماضی کے نقوش عالمِ تصورات سے اُبھر کر آنکھوں کے سامنے سے ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ ماضی کے دھندلکوں میں یاد کی کرنیں روشنی پیدا کر رہی تھیں۔ بیتے ہوئے لمحے اور گزرے ہوئے اوقات روشن صورت میں متمثل ہو رہے تھے۔ کتنا سرور تھا ان لمحوں میں اور کتنی فرحت بخش تھیں یہ خیالی تصویریں ـــــ ہر طرف خوشی و مسرت کا دَور دَورہ تھا ـــــ ہر سُو راحت و انبساط کی حکومت تھی، نہ کوئی غم تھا نہ پریشانی ـــــ زندگی کے یہ ایام میری حیات کی قیمتی متاع تھے جو نابود ہو گئے، اب صرف تصور باقی ہے!

یکایک میں لرز گیا، ایک جھٹکے سے یادوں کے تار اُلجھ کر رہ گئے۔ ایک جھرجھری سی آئی اور آنکھیں پُرنم ہو گئیں ـــــ میرے جانی دوست محمود کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے گردش کر رہی تھی محمود! ـــــ میرا دوست محمود! بے اختیار میرے مُنہ سے ایک دردانگیز چیخ نکلی اور میں عالمِ خیال سے اس دنیا میں واپس آ گیا ـــــ ذہن غم کے مارے بوجھل ہو رہا تھا ـــــ وفورِ غم سے میرے ہوش و حواس جواب دے رہے تھے۔ جی چاہتا تھا کہ لپک کر محمود سے جا ملوں۔

محمود کو جُدا ہوئے کئی سال ہو چکے تھے۔ تعجب ہے کہ جب لمبے عرصہ کے بعد محمود کی جدائی پہ صبر کی توفیق ملی تو پھر آج تک اس کی یاد نہ آئی۔ میں ایسے مواقع سے بچنے لگا جو اس کی یاد دلائیں کیونکہ محمود کی جدائی کا صدمہ میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ محمود میرا دن رات اور رنج و غم کا ساتھی تھا۔ اس کی رفاقت میرے دل کے سکون اور اطمینان کا باعث تھی۔ اس کی بے لوث محبت اور دوستانہ الفت میری رُوح کا قرار تھی۔ میری کامیاب زندگی اس کی مخلصانہ امداد اور اُلفت و اخوت کی رہینِ منت تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے اکیلے پن کا خیال تک نہ آتا تھا لیکن آہ! ـــــ وہی محمود مجھ سے دُور جا چکا ہے۔ ایسی جگہ جہاں سے واپسی ناممکن ہے اور نہ وہاں پہنچنا میرے اختیار میں ہے!!

اس تصور سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ اب مجھ میں ضبط کی طاقت ختم ہو رہی تھی۔ میں ماہیٔ بے آب کی طرح بے تاب تھا۔ کاش محمود سے میری ملاقات ہو جاتی، وہ آ جاتا یا میں اسی وقت اس کے پاس جا سکتا ـــــ لیکن نہیں ـــــ صرف ایک یاد باقی ہے، ایک دلدوز حسرت! ایک جگر پاش ناکام تمنا!! +

بشارت نذیر
ایف۔ایس سی (سال دوم)

خوش خُلقی انسانیّت کا زیور ہے

اچھی صورت کے لئے چاہیئے عادت اچھی
ورنہ کس کام کی اچھی سے بھی صورت اچھی
(اثر)

اگر ایک ہر لحاظ سے مکمّل عمارت میں اُلّو بول رہے ہوں یا کوئی نہایت خوبصورت شہر ہو مگر ویران پڑا ہو تو وہ شہر یا عمارت کس کام کی ــــ یا یُوں کہہ لیجئے کہ خول کی کوئی قیمت نہیں بلکہ قیمت مغز کی ہوتی ہے ــــ اسی طرح ایک انسان خواہ کیسا ہی خوش رُو اور خوش پوش ہے لیکن وہ خوش خلق نہیں تو وہ بھی بے مغز خول کی مانند ہے ــــ انسان کو انسان بنانے والی چیز خوش خُلقی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اِس بارے میں ارشاد ہے ــــ کہ:۔

"جب دو انسان آپس میں مصافحہ کرکے محبّت سے ملتے ہیں تو اُن میں ستّر رحمتیں تقسیم کی جاتی ہیں ان ستّر میں سے اُنہتّر تو اُس شخص کے حصّہ میں آتی ہیں جو اُن میں سے زیادہ خنداں اور کشادہ ہوتا ہے اور باقی کی (صرف ایک رحمت) دوسرے آدمی کے حصّہ میں آتی ہے۔"

ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ:۔

"جو کام سب سے زیادہ مغفرت بخش ہوگا وہ کشادہ روئی اور شیریں زبانی ہے۔"

ایک اور حدیث نبویؐ ہے کہ:۔

"قیامت کے دن جب انسانی اعمال کو ترازو میں رکھ کر تولا جائے گا تو خوش خُلقی سے زیادہ کوئی چیز وزنی نہ ہوگی۔"

حضرت علی مرتضیٰؓ کا فرمان ہے کہ "خندہ پیشانی سے پیش آنا سب سے پہلی نیکی ہے۔" اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ خوش خُلقی سے انسان دشمنوں کے دلوں کو بھی مسخّر کر لیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ترش روئی سے نفرت اور عداوت کے

مہیب ناسور انسانیت کے حسین بدن پر ظاہر ہو سکتے ہیں۔ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

اگر حنظل خوری از دستِ خوش خوئے
بہ از شیرینیٔ از دستِ ترش روئے

جو انسان ترش رُو ہے اُس کے پاس جانے کو جی ہی نہیں چاہتا ——— ! خُوئے بد رضائے الٰہی کے منافی ہے ——— کسی کو آپ کچھ دے نہیں سکتے تو کوئی بات نہیں، کسی کا آپ کوئی کام نہیں کر سکتے تو بھی کوئی حرج نہیں، لیکن یہ بات سراسر معصیت ہے کہ آپ ترش روئی سے پیش آئیں۔

ہر ایک چیز کی ذات اُس کی صفات سے پہچانی جاتی ہے۔ اگر کوئی چیز اپنی صفات چھوڑ دے تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ آگ کے اندر جب تک روشنی اور گرمی موجود رہتی ہے شیر اور ہاتھی تک اُس کے نزدیک نہیں پھٹکتے۔ مگر جونہی وہ اپنی صفات گنوا دیتی ہے چیونٹیاں تک اسکو روندتی چلی جاتی ہیں۔ پس ذاتی صفات ہی ہیں جو ایک چیز کا وقار قائم رکھتی ہیں۔ اسی طرح انسان کا وقار قائم رکھنے والی بڑی صفت خوش خلقی ہے۔ اس کے بغیر انسان بھی ایسا بے وقعت ہے جیسے پھول اور پھل نہ دینے والے پودے ——— انسان کے اندر انسانیت ہی یہی ہے کہ وہ خوش خلق اور خوش مزاج ہو۔ یہی بشر کی بشریت ہے اور آدمی کی آدمیت ——— نیک سیرت کا ہی دوسرا نام انسانیت ہے اور خوش خلقی نیک سیرت کا ایک نمایاں حصہ ہے ——— یہ بھی ضروری ہے کہ خوش خلقی میں خلوص ہو، ریاکاری سراب ہے اور سراب حقیقت سے کوسوں دُور ———

ایک انگریز چارلس ٹامس نے لکھا ہے کہ خوش خُلقی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ کوئی آدمی جگہ جگہ صرف کہتا ہی پھرے کہ دیکھئے جناب مَیں کیسا خوش خُلق ہوں لیکن عمل سے اس کا کوئی ثبوت نہ دے اور دوسرا یہ کہ ایک آدمی دل میں پکا ارادہ کر لے کہ مَیں اپنے بھائیوں کی ضرور دلجوئی کروں گا لیکن زبان سے اِس بارہ میں کچھ بھی نہ کہے۔ لہٰذا مؤخر الذکر انسان ہی حقیقی معنوں میں خوش خُلق ہے۔

پس ہمیں خوش خُلقی کے حسین زیور کو پہن کر انسانیت کی زیب و زینت کو دوبالا کرنا چاہیئے۔ یہی ایک نیک انسان کا حسن ہے اور یہی آدمیت کا سنگار ؎

خندہ رُو بودن بہ از گنج و گہر بخشیدن است
تا توانائی برق بودن ابر نیسانی مباش !

کہ مال و زر دینے کے مقابلہ میں خندہ پیشانی سے پیش آنا اچھا ہے۔ تُو بجلی کی طرح ہنس مکھ رہ۔ کالی گھٹا کی طرح سڑیل نہ بن ؛

فلاسفر

قصّہ فلاسفروں کا.....

(فلاسفی کے طلبا اور.... سے معذرت کے ساتھ)

خیالات میں گُم فلاسفر صاحب جب مکان میں داخل ہوئے تو تھکان سے جسم چُور ہو رہا تھا۔ سوچا کہ بس فوراً ہی چھڑی کو نہیں رکھ کر بستر پہ دراز ہو جائیں گے۔ کمرے میں داخل ہوئے، چھڑی کو آرام سے بستر پر رکھا اور خود خاموشی سے ایک کونے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ !!

تین فلسفی دنیا کے شور و غل سے اُکتا کر ایک سُنسان ویرانے میں جا نکلے۔ جب ایک سال انتہائی خاموشی میں گزر گیا تو ایک فلسفی نے بڑی آہستگی سے کہا۔ "بڑی خاموشی ہے"۔

اس بات پہ ایک اور سال گزرا تو دوسرے فلسفی نے تائید کرتے ہوئے کہا ــــ "واقعی"

ایک سال اور گزر گیا تو تیسرا فلسفی یہ کہہ کر چل دیا۔ "تم بہت شور کرتے ہو"

بیگم بڑے طیش میں کہہ رہی تھیں "دیکھئے غضب ہو گیا، اخبار کے صفحہ اوّل پر آپ کی وفات کی خبر شائع ہو گئی ہے ظالموں نے اچھے بھلے زندہ آدمی کو قبر میں اُتار دیا....."

فلاسفر خیالات میں گم تھا، سر اُٹھا کر بیگم سے مخاطب ہوا "بڑا افسوس ہوا ــــ بیگم میں بے حد مصروف ہوں، ایک کام کرو کہ میری طرف سے مرحوم کے ورثاء اور بچگان کے نام دلی تعزیت کا پیغام فوراً بھجوا دو"

فلاسفر، گنجا اور ایک حجام ہم سفر تھے، راستے میں رات نے آلیا تو انہوں نے سونے کا پروگرام اس طرح بنایا کہ پہلے حجام پہرہ دے، پھر فلاسفر اور آخر میں گنجا۔ پہرہ دیتے ہوئے حجام کا جو جی گھبرایا تو اس نے دل بہلانے کے لئے اُسترا نکال کر فلاسفر کے سر سے شغل فرمانا شروع کر دیا۔ فلاسفر نے اپنی باری پہ سوچتے وقت عادتاً اپنے سر پہ ہاتھ جو پھیرا تو بڑا جھلایا "بیوقوف گدھا کہیں کا باری میری تھی اور اُٹھا دیا گنجے کو"

ایک فلاسفر نے دوسرے سے کہا "میرا ارادہ ہے کہ میں ساری دنیا کے کارخانے خرید کر اپنی تحویل میں لے لوں"

دوسرے فلاسفر نے بڑے اعتماد سے جواب دیا "تم کیسے خرید کر سکتے ہو، فی الحال میرا ان کو بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں"

آنکھوں کی حفاظت

مشہور ہے کہ آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے۔ علم ہم جتنا آنکھوں سے سیکھتے ہیں کان یا کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں سیکھتے۔ قدرت نے آنکھ کو بہت ذکی الحس اور حساس بنایا ہے۔ جسم میں آنکھ سے زیادہ حساس اور کوئی عضو نہیں اس وجہ سے ہمیں اسکی بہت قدر کرنی چاہیئے اور ان کی حفاظت اور صحت برقرار رکھنے کیلئے ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیئے۔ آنسو بھی آنکھوں کو غسل دیکر قدرتی طور پر ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ نابینا لوگوں کی بے کسی اور زبوں حالی دیکھ کر ہمیں اپنی آنکھوں کی قدر کرنی چاہیئے ——— اپنی آنکھوں کو قسمت اور قدرت کے حوالہ نہ کر دیجئے بلکہ بڑی توجہ اور اہتمام سے اپنی آنکھوں کی خبر گیری کیجئے تاکہ آپ عمر بھر اپنی خبر گیری کر سکیں اور یہ آنکھیں اس خبر گیری میں آپ سے تعاون کر سکیں۔ انہیں مناسب خوراک، آرام، روشنی، ورزش، تازہ ہوا، پانی، سورج کی روشنی اور ڈھیلا پن بہم پہنچایئے۔ جب ذرا بھی محسوس ہو کسی ماہر امراض چشم سے رجوع کیجئے۔ اگر آپ کو آج اور آئندہ زندگی میں اپنی آنکھوں سے ٹھیک طور سے کام لینا ہے تو انہیں کافی آرام پہنچایئے۔ یہ امید نہ رکھئے کہ انہیں بے احتیاطی اور بے پروائی سے برے طریقے سے استعمال کرنے کے باوجود یہ ٹھیک طور پر کام کرتی رہیں گی۔ چوبیس گھنٹے میں چھ گھنٹے سے آٹھ گھنٹے تک کی نیند میں آنکھوں کا بند رہنا، انہیں آرام دینا ضروری ہے۔ جن کمروں میں آپ مطالعہ کرتے ہیں یا جن جگہوں کو آپ کام یا کسی ایسی تفریح کیلئے استعمال کرتے ہیں جہاں آنکھوں کو بہت قریب سے دیکھنا پڑے وہاں مناسب روشنی کا انتظام ہونا چاہیئے۔ تاریک گوشوں میں کرن دار روشنیوں پر اکتفا نہ کیجئے۔ نہ کسی کمرے میں چند تیز روشنیوں کا اہتمام کیجئے۔ جہاں انہیں بار بار روشنی کی مطابقت کرنی پڑتی ہے تو آنکھوں پر بہت بار پڑتا ہے۔ سب سے بہتر وہ منتشر روشنی ہے جس سے سارا کمرہ بھرپور روشن ہو۔ آپ کی آنکھوں کے لئے بہتر یہ ہے کہ روشنی کا ماخذ مطمح نظر سے باہر ہو۔ لیمپ کو آنکھوں کی سطح سے اوپر رکھئے۔ اس طرح روشنی آپ کے سامنے سر کے اوپر سے پڑیگی اور نیچے سے براہ راست آپکی آنکھوں کو نشانہ نہیں بنائے گی۔ اطبا کا اس امر پر اتفاق ہے کہ روشنی بھی ماہیت کے اعتبار سے اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی اسکی مقدار۔ یہ ممکن نہیں کہ وہ صحیح مقدار بتادی جائے جو ہمیشہ کیلئے ضروری ہے۔ لوگوں پر ایک ہی چیز کا یکساں اطلاق نہیں ہوتا۔ ایک ہی شخص کی دونوں آنکھیں ہمیشہ ایک جیسا اثر نہیں قبول کرتیں۔ صرف روشنی کا ہونا کافی نہیں، روشنی آپ کے نزدیک بھی ہونی چاہیئے تاکہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ روشنی کے ماخذ سے ایک فٹ کے فاصلے پر، اس سے تین فٹ کے فاصلے کے مقابلے میں ۹ گنی زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ سہولت کیلئے یہ ضروری ہے کہ روشنی بکھری ہوئی ہو اور چکاچوند نہ ڈالے۔ چکاچوند آپ کی آنکھوں کے لئے مضر ثابت ہوتی ہے۔ چکاچوند سے آنکھیں سکڑ جاتی ہیں اور بصارت گھٹ سکتی ہے۔ ہمیشہ خیال رکھئے کہ خیرہ کن روشنی کو روکنے کے لئے آپ کے لیمپ پر شیڈ لگا ہوا ہو۔ آنکھوں کو صحت مند اور تندرست رکھنے کے لئے جسمانی تندرستی اور صحت مند زندگی کے تمام پہلوؤں پر توجہ کیجئے کیونکہ آپ کی آنکھوں کی صحت کا انحصار بہت حد تک آپ کی جسمانی صحت و تندرستی پر ہے +

(مقتبس)

لطف الرحمٰن محمود

چشمِ بد دُور

(بعض نوخیز شعراء سے معذرت کے ساتھ)

کسی اخبار یا رسالے کا ایڈیٹر ہونا ایک لحاظ سے اچھی خاصی مصیبت بھی ہے۔ آپ کہیں گے کہ نہیں صاحب! یہ تو گپ ہے، ایڈیٹروں کے تو بڑے ٹھاٹھ ہوتے ہیں، ان کی علمیت کا ڈنکا بجتا ہے۔ عام اور خاص ——— شاعر اور افسانہ نویس ——— مضمون نگار اور ادیب، ایڈیٹروں کو دوست ——— بنانے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ دعوتوں میں ان کی شمولیت فخر کا موجب سمجھی جاتی ہے خواہ وہ دس دس آدمیوں کا راشن چٹ کر جائیں ——— لیکن میں اس کے باوجود اپنی رائے پر قائم ہوں کہ ایڈیٹر ہونا ایک لحاظ سے اچھی خاصی مصیبت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آئے دن ادب کے "جاں نثار فدائیوں" اور "ان تھک معماروں" کی طرف سے بڑے بڑے نادر اور انمول مضامین ——— افسانے ——— مقالے ——— غزلیں ——— نظمیں اور رباعیاں اور بعض ایسی چیزیں جو بالکل نئی ہوتی ہیں آتی رہتی ہیں۔ اس زمانے میں ویسے ہی ان مصنوعات کا زور ہو گیا ہے۔ اردو شاعری یوں تو ابتدا ہی سے ایک وبائی قسم کی چیز رہی ہے۔ اس زمانہ میں ٹی بی اور کینسر کی طرح اس وبا کو بھی خاص و عام دونوں میں "مقبولیت" حاصل ہو رہی ہے۔

صاحب! اس زمانے کے کیا کہنے!! ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمیں یہ زمانہ دیکھنا میسر آ گیا۔ اس زمانے میں بڑے بڑے انقلاب رونما ہوتے ہیں۔ آئے دن نئے نئے فیشن دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ بڑے بوڑھے تو کان پکڑے پھر تے ہیں۔ اور دادی اماں، نانی اماں، گھر والے ہی انگشت بدنداں ہیں۔ زمانے نے بڑا پلٹا کھایا ہے۔ اب دیہاتی نوجوان سرسوں کے تیل کی بجائے "ہمول" یا "ڈالڈا" گھی کی مالش کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں اور لسی کی بجائے چائے کے رسیا ہو چکے ہیں اور پان کی رلیس میں پیپل یا برگد کے پتے توڑ کر چبانے لگتے ہیں۔ دیہات کو چھوڑ چھاڑ کر شہروں میں آ بیٹھے۔ لباس، وضع قطع میں بھی فرق آ گیا ہے۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے کے اصول ہی بدل گئے ہیں۔ اللہ بخشے اکبر الٰہ آبادی مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں ؏

عمر ہوٹلوں میں کٹ گئی مرے ہسپتال جا کر

اب گھر کے صاف ستھرے کھانے کی بجائے بابو صاحب ہوٹل کے کھانوں پہ فریفتہ ہیں۔ خواہ وہاں مکھیوں کے انڈے اور بیماری سے مری ہوئی مرغیاں ہی "حلال" کر کے پکائی گئی ہوں اور گھی کی بجائے انہیں گریس سے پکایا گیا ہو۔ ایسی تیسی گھر کے

کھانوں کی، ہوٹل میں بیٹھ کر ڈینگیں مارنے میں جو شان ہے وہ گھر میں کہاں ؟ اسی طرح کالر ٹائی کے فٹ فاٹ ہونے کا بھی بڑا خیال رکھا جانے لگا ہے ٹائی کی "ناٹ" ضرور چست ہونی چاہیئے خواہ اندر سے صاحب بہادر کی بنیان میلی اور بو سے کول تار بن چکی ہو۔!

بہرحال بہت کچھ بگڑ چکا ہے۔ ہر طرف ترقی ہی ترقی ہے۔ اللہ رکھے "ادبی ذوق" نے بھی بڑی ترقی کی ہے۔ خصوصاً قیامِ پاکستان کے بعد جب یو پی، سی پی میں "پودینے کے باغ" اجڑے ہیں اور یہاں "پان، بیڑی، سگریٹ" کی دکانوں کا زور ہوا ہے اب تو پنواڑی حضرات یعنی "دردِ گُردہ" بیچنے والوں کے ساتھ اٹھک بیٹھک سے اَن پڑھ لوگوں میں بھی ادبی ذوق پیدا ہو گیا ہے۔ پیسے کھڑکا کر "ماہیئے" پڑھنے والے آج "غالب کی نیم آزاد شاعری" پر مقالے پڑھتے پھرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کو کافی فروغ ہوا ہے۔ اب یہ حالت ہے کہ ایک اینٹ اٹھائیں تو کئی شاعر ٹرانے لگتے ہیں۔ اکثر اپنے تئیں چچا غالب کا بھتیجا سمجھتے ہیں اور انہیں "عزیزم چچا صاحب" کہہ کر یاد فرماتے ہیں۔ شاعری اور ادب پہ احسان کرنے کا رجحان کالج نشین شہزادگانِ عالی وقار میں کافی ترقی کر رہا ہے۔

کالج نشین نوجوانانِ ملت کو جناب جوش ملیح آبادی نے ایک نظم میں بڑی عقیدت کے ساتھ یاد کیا ہے۔ فرماتے ہیں "نازک اندامانِ کالج مرحبا ۔۔۔۔" اس پر بعض لوگوں نے جوش صاحب کی بڑی مذمت کی ہے کہ "قوم کے ستونوں" کو یہ شرابی کبابی "نازک اندام" کہتا ہے۔ لوگ تو لٹھ لے کر جوش صاحب پر چڑھ دوڑے ہیں کہ لیجیو، دوڑیو، پکڑیو ـــــ ہمارے بچوں کی شان میں جوش نے گستاخی کا ارتکاب کیا ہے ـــــ لیکن خواہ اب لٹھ بمعہ آپ اپنا رخ میری طرف ہی کیوں نہ کرلیں میں یہی کہوں گا کہ بےچارے جوش صاحب کا کچھ زیادہ قصور نہیں۔ سکول کے طلبہ جب کالج کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے برکت بخشتے ہیں تو ان میں فوراً خاص تبدیلی آجاتی ہے، گویا خون بدل جاتا ہے۔ ویسے بھی داخلہ جون کے مہینے میں ہوتا ہے۔ کالج میں وارد ہوتے ہی گویا ایک "کلرک" "سی۔ ایس۔ پی آفیسر" بن جاتا ہے! وضع قطع، چال ڈھال بلکہ بعض اوقات کھال تک بدل جاتی ہے۔ بعض دوست جو سکول میں اتنی کھلی پینٹ پہنتے تھے جیسے بیک وقت تین چار اچھے خاصے موٹے تازے سیم و شحیم رنگروٹ پہن سکتے تھے، کالج میں آتے ہی اتنی چست اور تنگ پینٹ استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ نوکروں اور دو تین ہمسایوں کی مدد کے بغیر اس کے اتارے جانے کا امکان ہی نہیں۔ میں ذاتی طور پر ایک ایسی ہی "Opening Ceremony" کا عینی شاہد ہوں۔

پھر بالوں کو لیجیے، ایسے طلبہ سکول میں جن کے بالوں کی کٹائی کا انداز ایسا تھا کہ ماتھے پر بڑی تقسیم کا سوال آسانی سے نکالا جا سکتا تھا، کالج میں آتے ہی اچانک "فلمیریا" کے اثر سے ہیرو بن گئے۔ بعض اصحاب نے سکول والی کوے کی دلکش چال کو یکسر ترک کر کے ہنس کی چال چلنا شروع کر دیا۔ یہ انقلابات ایسے ہیں جن کا جسم کے ساتھ تعلق ہے، ذہنی اور جذباتی زندگی میں بھی انقلاب بلکہ "انقلابِ فرانس" رونما ہوتا ہے۔ علم و فضل میں تو "تحریکِ احیائے علوم" جیسا انقلاب برپا ہو جاتا

ہے۔ کیونکہ افلاطون اور ارسطو کی روحیں اُن سے ٹیوشن پڑھنا شروع کر دیتی ہیں۔ جذباتی زندگی کی ہلچل سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ "عشقیہ یا" کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔ بعض فدائی تو اتنے زیادہ "دل پھینک" ہو جاتے ہیں گویا دل کرایے پر لیا ہوا ہے یا کسی سے مانگ لائے ہیں۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ ساتھ ہی شعر و شاعری کا "زور" ہو جاتا ہے۔ فزکس کی کتاب پر ایک تازہ غزل لکھی ہے تو کیمسٹری کی کتاب پر ایک پرانی رباعی ہے۔ پریکٹیکل کی کاپی پر ایک طرف تو تجربات کے مشاہدات ہیں تو دوسری طرف حضرت کا "دیوان" کھلا ہے۔ پھر بعض جانباز انتہائی تازہ یعنی تازہ ترین "مصرعے" جابجا کالج کی دیواروں پر رقم کرتے ہیں بلکہ یہ مصرعے بعض رول نمبر زکو از راہِ نوازش "ڈیڈیکیٹ" کئے جاتے ہیں!! اسکے علاوہ بھی کچھ "شعری سرمایہ" بچ جاتا ہے۔ چنانچہ دو تین بیاضیں بشرٹ کی جیبوں میں احتیاط سے رکھ لی جاتی ہیں، ایک دیوان پینٹ کی پچھلی جیب میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ ایک صاحب شلوار ہی زیب تن کرتے ہیں انہوں نے اپنی غزلیں اور نظمیں نیفے میں ڈالی ہوتی ہیں۔ کیا معلوم کب ضرورت پڑ جائے!!

اس صورتِ حال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کالج میں قدم رکھتے ہی ادبی شعور کس طرح ترقی کر جاتا ہے!! یہی ادبی شعور کالج میگزین کے ایڈیٹر کے لئے بلائے جان بن جاتا ہے۔ کیونکہ شعراء کے "جتھے" ایڈیٹر کی بلائیں لینے لگتے ہیں۔ غزلوں پر غزلیں آ رہی ہیں اور ہر غزل میں دو دو سو اور بسا اوقات تین تین سو شعر موجود ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرے ایک کلاس فیلو نے ڈیڑھ دو گز لمبی غزل کالج کے نوٹس بورڈز کے درمیان لگوائی تھی۔ چونکہ یہ طویل غزل "سبع معلقات" کو بھی روند گئی تھی اس لئے اچھا خاصہ عکاظ کا میلہ نوٹس بورڈز کے قریب لگ گیا۔ شادی، خان اور دو تین اور اصحاب نے بڑی مشکل سے اس غزل کو کھرچا اور پانی بہا کر اس کے آثار مٹائے تب کہیں ٹریفک بحال ہوئی تھی!!

بعض غزلیں مختصر بھی ہوتی ہیں۔ بعض غزلوں کا تو صرف ایک ہی مصرعہ ہوتا ہے یعنی ان غزلوں کا ہر مصرعہ دوسری بحر میں جا پڑتا ہے۔ یہ مختصر اور طویل غزلیں، بڑے بڑے عجیب و غریب افسانے (ان میں سے بعض دوسرے رسالوں میں اصل مصنفین کے ناموں کے ساتھ شائع بھی ہو چکے ہوتے ہیں) یہ سارے ادب پارے بڑے وقار کے ساتھ ایڈیٹر پر احسان دھرتے ہوئے اُسے مرحمت فرما دیئے جاتے ہیں۔ کئی احباب تو اتنا تکلف کرتے ہیں کہ گویا سیلاب زدگان کے "ریلیف ورک" کے لئے کوئی لاکھ ڈیڑھ روپے کا چیک عطا کر رہے ہیں یا کانووکیشن میں "ڈاکٹریٹ" کی ڈگری عطا ہو رہی ہے۔

دوسرے رسائل کی نسبت کالج میگزین کا ایڈیٹر زیادہ خوش قسمت یا بدقسمت ہوتا ہے۔ بدقسمت اس لحاظ سے کہ اگر ان احباب کے "کلام بلاغت نظام" کو شائع کرنے سے معذوری کا اظہار کرے تو ادب کے معماروں کی طرف سے "شوکاز نوٹس" (Show Cause Notice) جاری ہو جاتے ہیں۔ بعض "مجاہدین" تو بے چارے ایڈیٹر کا "گوشت کھانا شروع کر دیتے ہیں" ——— ایڈیٹر کو "مغرور" ——— "حاسد" ——— "عاشق" ——— "بد دماغ" ——— "کم فہم" ——— "رجعت پسند" ——— "قدامت پرست" ——— "جدت پسند" ——— "ملونٹا" ——— "دہریہ" ——— "کمیونسٹ"

غرض بڑے بڑے خطابات اور القابات سے نوازا جاتا ہے ———— ایک لحاظ سے یہ ایڈیٹر خوش قسمت بھی ہوتا ہے اور وہ اس طرح کہ فارغ اوقات سے لطف اندوز ہونے کے لئے یہ ادب پارے بڑے ہی مفید اور مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ میری خوش قسمتی پر آپ کو شاید رشک آئے گا کہ استحقاق نہ رکھنے کے باوجود مجھے بھی ایسے نوادر کی جیتے جی زیارت ہوگئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بخل سے کام نہ لوں اور ایک دو نوادر سے آپ کی آنکھوں کو بھی ٹھنڈک پہنچاؤں کہ ع

ایں سعادت بزورِ بازو نیست !!

(۱)

کوئی بزرگ "ریحان" صاحب ہیں جو اب تک متعدد تخلص اختیار فرما چکے ہیں، ان کا ایک تخلص "بادی" ہے کیونکہ آپ کو اکثر اپنا اور اپنے والد صاحب کا نام بھی بھول جاتا تھا۔ اب تو اول ہر ہفتے ورنہ مہینے میں دو بار ضرور اپنا تخلص بدل ڈالتے ہیں۔ مضمون کے اشاعت پذیر ہوتے ہوتے وہ دو تین مرتبہ ضرور تخلص کی کینچلی بدلیں گے کسی زمانے میں جب آپ دریائی سیر کو جاتے تھے اور راستے میں ریت سے واسطہ پڑتا تھا، آپ نے وادیٔ نجد کی نسبت سے اپنا تخلص "وادی" کر لیا۔ جب ان کی دادی اماں محترمہ بیمار ہوئیں اور ہسپتال روڈ پر آمد و رفت بڑھ گئی تو انہوں نے اپنا تخلص "دادی" کر لیا۔ کچھ عرصہ ان کا تخلص "بادی" بھی رہا ہے۔ ممکن ہے ان دنوں کسی نیم حکیم کے طبی مشورے سے بادی اشیاء بکثرت استعمال کرتے ہوں۔ خیر اس میں ہمیں جلنا نہیں چاہیئے، اللہ کی دین ہے جسے دے۔ سب سے پہلے میں انہی کی غزلیات پیش کروں گا لیکن اصولی طور پر یہ گزارش ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ سارے حوالہ جات "نقل مطابق اصل" کے اصول پر پیش کئے گئے ہیں۔ اگر کسی مقام پر کوئی شعر زمین کی کششِ ثقل کے دائرۂ اثر سے باہر چلا جائے یعنی بہت اونچا ہو جائے یا اس کی بندش چست ہو جائے یعنی "tight" ہو جائے یا کیمسٹری کی اصطلاح میں "Air tight" ہو جائے تو اس خاکسار نابکار، جاہلِ مطلق کا کارنامہ نہ ہوگا بلکہ شعرائے عظام کی سخنوری کا کمال ہوگا۔

اب "ریحان" صاحب کا کلام ملاحظہ ہو۔ حضرت فرماتے ہیں ؎

"اگر آئے تم دیر سے تو پھر ہم انتظار کر لیں گے
اگر تم رل گئے ہم کو ہم نے بیا پار کر لیں گے
نہ کر ہمیں تو اس طرح برباد نظروں سے
ہم تو پہلے ہی برباد ہیں زخموں سے پیار کر لیں گے
بلا نہ کر ہمیں اگر تجھ جیسا پیار دے
تو ہم بغیر ساقی کے زندگی گزار کر لیں گے

جو تم نہ آئے تُربت پہ مرجانے کے بعد
تو ہم جنت میں تمہارا انتظار کرلیں گے

دیکھئے حضرات! خدا لگتی کہیئے۔ کتنا اعتماد ہے۔ یہ شعر پڑھ کر ہمیں تسلّی ہوئی کہ ایک پنجابی شاعر نے سچ کہا ہے ؎

"عاشق موئے نئیں قبراں وچ کرنگ پئے ہلدے نی"

یعنی عاشق صاحبان مرنے کے باوجود زندہ ہیں کیونکہ قبروں میں اُن کے پنجر محبوب کی یاد میں بے چینی سے حرکت کر رہے ہیں۔"

مگر یہاں تو معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ اوّل تو شاعر صاحب کو جنت میں تشریف لے جانے کا یقین کامل ہے۔ دوسرا پہلو ان کا حیران کن استقلال ہے جس کے طفیل وہ جنت میں بھی معشوق صاحب کی جستجو میں چلّہ کشی جاری رکھیں گے گویا غالب کے ہمنوا ہیں ؎

اِن پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

ان کی دوسری غزل ملاحظہ فرمائیے۔ یہ غزل پہلی غزل کا نشہ بھی ہرن کر دے گی۔ فرماتے ہیں ؎

"مَیں تیری یاد میں پگھل رہا ہوں پیارے
مَیں پہلے ہی نشہ میں تھا اب اَور کر دیا"

تھوڑی بہت فزکس ہم نے بھی پڑھنے کی کوشش کی ہے مگر نشہ اور نقطۂ پگھلاؤ کا باہمی تعلق آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ غالباً کوئی بالکل نئی تھیوری ہے ـــــ جس کا ابھی تک کتابوں میں ذکر نہیں آسکا۔ معلوم نہیں "ریحان" صاحب کا نقطۂ پگھلاؤ (Melting Point) کیا ہے؟ ٹنگسٹن دھات جتنا تو خیر ضرور ہوگا ہی۔ بہرحال اس کا تعلق فزکس یا کیمسٹری کی لیبارٹری سے ہے آپ ان کے دوسرے شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

"تُو اگر بھول گیا ہے مجھے اے جانِ نصیب
مَیں پہلے ہی فراموش تھا اب اَور کر دیا
آنکھیں ترس گئی ہیں تجھے بغور دیکھنے کیلئے
مَیں پہلے ہی غمگین تھا اب اَور کر دیا

دیکھئے لفظ "بغور" نے شعر میں جان پیدا کر دی ہے بلکہ شعر کا "بلڈ پریشر" ہائی کر دیا ہے۔ شاعر صاحب معشوق کو دیکھنے کے لئے "مائیکروسکوپ" سیٹ (Set) کر کے بیٹھے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے اُن کا "فوکس" نہیں ہو سکا۔

جو تم نہ آئے تُربت پہ مرجانے کے بعد
تو ہم جنت میں تمہارا انتظار کرلیں گے

دیکھئے حضرات! خدا لگتی کہیئے۔ کتنا اعتماد ہے۔ یہ شعر پڑھ کر ہمیں تسلّی ہوئی کہ ایک پنجابی شاعر نے سچ کہا ہے ؎

"عاشق موئے نئیں قبراں وچ کرنگ پئے ہلدے نی"

یعنی عاشق صاحبان مرنے کے باوجود زندہ ہیں کیونکہ قبروں میں اُن کے پنجر محبوب کی یاد میں بے چینی سے حرکت کر رہے ہیں"

مگر یہاں تو معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ اوّل تو شاعر صاحب کو جنت میں تشریف لے جانے کا یقین کامل ہے۔ دوسرا پہلوان کا حیران کن استقلال ہے جس کے طفیل وہ جنت میں بھی معشوق صاحب کی جستجو میں چلّہ کشی جاری رکھیں گے گویا غالبؔ کے ہمنوا ہیں ؎

اِن پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حُوریں اگر واں ہوگئیں

ان کی دوسری غزل ملاحظہ فرمائیے۔ یہ غزل پہلی غزل کا نشہ بھی ہرن کر دے گی۔ فرماتے ہیں ؎

"مَیں تیری یاد میں پگھل رہا ہوں پیارے
مَیں پہلے ہی نشہ میں تھا اب اَور کر دیا"

تھوڑی بہت فزکس ہم نے بھی پڑھنے کی کوشش کی ہے مگر نشہ اور نقطۂ پگھلاؤ کا باہمی تعلق آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ غالباً کوئی بالکل نئی تھیوری ہے ——— جس کا ابھی تک کتابوں میں ذکر نہیں آسکا۔ معلوم نہیں "ریحان" صاحب کا نقطۂ پگھلاؤ (Melting Point) کیا ہے؟ ٹنگسٹن دھات جتنا تو خیر ضرور ہوگا ہی۔ بہرحال اس کا تعلق فزکس یا کیمسٹری کی لیبارٹری سے ہے آپ ان کے دوسرے شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

"تُو اگر بھول گیا ہے مجھے اے خوش لقیب
مَیں پہلے ہی فراموش تھا اب اَور کر دیا
آنکھیں ترس گئی ہیں تجھے بغور دیکھنے کیلئے
مَیں پہلے ہی غمگین تھا اب اَور کر دیا

دیکھئے لفظ "بغور" نے شعر میں جان پیدا کر دی ہے بلکہ شعر کا "بلڈ پریشر" ہائی کر دیا ہے۔ شاعر صاحب معشوق کو دیکھنے کے لئے "مائیکروسکوپ" سیٹ (Set) کر کے بیٹھے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے اُن کا "فوکس" نہیں ہو سکا۔

کیونکہ اگلے شعر میں فرماتے ہیں ؎

"دے دینا قاصد میرا یہ پیغام انہیں
مَیں پہلے ہی بدنصیب تھا اب اَور کر دیا"

خیر جو سخن گسترانہ بات "ریحان" صاحب نے مقطع میں بیان فرمائی ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ میری حقیر رائے میں تو غالب، ذوق، مومن، آتش، داغ اور جگر، یہ سارے مل کر بھی اگر یہ مضمون باندھنے کی کوشش کرتے تو شاید "کمپارٹمنٹ" بھی نہ آتی۔ اگر یہ لوگ زندہ ہوتے تو اوّل تو خوشی سے ہی مرجاتے ورنہ چھانگا مانگا کے جنگلوں میں کپڑے پھاڑ کر ضرور چلے جاتے۔ حضرت فرماتے ہیں ؎

"نہیں تجھ سے کام کچھ ریحان بدنصیب کو
بگڑا مرا نصیب ہے اب اَور کر دیا

(۲)

جب اس غزل کے محاسن پر تبصرہ لکھنے کے بعد وفورِ جذبات میں ہم از خود رفتہ ہو گئے تو ہمارے ایک بھائی نے پوچھا کہ آپ یہ کیا لکھ رہے تھے۔ مَیں نے بتایا کہ رسالے کے لئے بعض غزلیں آئی ہیں وہ اشاعت کیلئے بھجوانا ہوں۔ انہوں نے جھٹ اپنی ایک نظم پیش کر دی جو انہوں نے پانچ سات منٹ کی کاوش کے بعد لکھ دی۔ خیر جب ہم نے یہ بلند پایہ نظم دیکھی تو مارے "وجد" کے ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پاس پڑی ہوئی "وِکٹ" سے ہم نے بھائی صاحب کو بڑی فراخ دلی سے "دادِ سخن" دی۔ اِس پٹائی کے بعد ان کا خمارِ شاعری اُترا۔ اور اُنہوں نے ہمارے ہاتھ پر شاعری سے توبہ کی۔ اُن کی شاعری کچھ "نیم روحانی" قسم کی ہے۔ ان کی نظم کے جن حصّوں کا "ریحان" صاحب کی غزل کے ساتھ توارد ہو گیا ہے وہ مَیں نظر انداز کر دوں گا، باقی نظم پیش کر دوں گا۔ فرماتے ہیں ؎

"نئے ستارے نکل آئے" (عنوان)

ہوا غروب آفتاب
کشف بھی دکھائی دینے لگے

بھائی صاحب قبلہ کی "روحانی قوت" ملاحظہ ہو، غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی کشف کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے ویسے جب آپ نظم لکھنے میں مصروف تھے تین ساڑھے تین بعد دوپہر کا وقت ہو گا۔ اگلے بند کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

جب اندھیرے نے زور ڈالا
تو چاند نے بھی سر نکالا

اگلا شعر بھائی صاحب نے ہمارے قد کی مناسبت سے ذرا ضرورت سے زیادہ ہی لمبا کر دیا ہے ؎

گئی تاریکیاں دُور اس جگہ آئی روشنی
گرمی کی شدت سے میدان میں ٹھنڈ ہوئی

آگے چل کر فرماتے ہیں ؎

اتنے میں دیکھا کہ تاروں کے جال ؛ نکل آئے کچھ ستارے ہیں کمال

قارئین گرامی کو یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ ایک ہی نظم کے اشعار ہیں — !!

(۳)

یہ تو خیر نچے تھے اور اس پر طرّہ یہ ہے کہ بحور اور قیود اور علائم و رموز اور روایاتِ نظم و غزل کے ہاتھوں مجبور اور معذور تھے ۔ آزاد نظم میں تو مقابلتاً آسانی ہوتی ہے ۔ ادب پاروں کا جو پلندہ اس وقت خاکسار کے پیشِ نظر ہے ان میں اکثر "آزاد" ہیں ۔ ایک "رضا" صاحب ہیں ۔ ایک "بھٹی" صاحب ہیں ۔ ایک صاحب نے اپنا اسم گرامی غالباً حروفِ ابجد کے لحاظ سے "ع ۔ ب" لکھا ہے ۔ ان کی نظم تمام آزاد منظومات سے اعلیٰ ہے ۔ انہوں نے نام کے بارے میں اخفا سے اس لئے کام لیا ہے کہ کہیں پورا نام پتہ عوام کو معلوم نہ ہو جائے اور مبارکباد کے خطوط اور تاروں کا تانتا نہ بندھ جائے ۔ معلوم ہوتا ہے آپ بھی "حلقۂ اربابِ بد ذوق" سے متعلق ہیں ۔ انہوں نے نظم کے ساتھ "فٹ نوٹ" لکھا ہے جو تقریباً ایک فٹ لمبا ہے ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں اپنی بلند پایہ تخلیق کو ماہِ نو — قندیل یا نگار وغیرہ میں شائع کرانا چاہتا تھا ۔ مگر میرے پیارے . . . . میگزین کا مجھ پر زیادہ حق ہے ۔" ہمیں اس جذبے اور ایثار کی قدر کرنی چاہیئے ۔ اس قسم کے مخلص وجود بڑی مشکل سے دنیا میں آتے ہیں اور "برتھ کنٹرول" اور "فیملی پلاننگ" کے دور میں تو اور بھی قلت ہو جاتی ہے ۔ خیر اسے چھوڑیئے یہ علیحدہ موضوع ہے ۔ "ع ۔ ب" صاحب کی نظم "ساحلِ سمندر" کے نظاروں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے ممکن ہے بارش کی وجہ سے کہیں چھت ٹپک رہی ہو اور آپ کی طبیعت شعر کی طرف راغب ہو گئی ہو ۔ اس "تبرک" کے چند بند ملاحظہ ہوں ۔ "پر بند" کھانے نہ شروع کر دیجئے ورنہ بدہضمی ہو جائے گی آپ کو ۔ یہ بند سننے اور سمجھنے کے لئے ہیں ۔ فرماتے ہیں ؎

کاٹ دو چٹانوں کو

کاٹ دو اے لہرو ۔ اے لہرو کاٹ دو
کاٹ دو سمندر کی ٹھٹھری ہوئی سفید چٹانوں کو
مگر یہ چٹانیں اور وہ بھی سفید سفید
کہاں سے آ گئی ہیں اس سمندر کے بیچ ۔

مگر کاٹ دو اے لہرو ان چٹانوں کو

خدا جانے ان چٹانوں نے ع - ب صاحب کا کیا بگاڑا کیوں یہاں "الٹی میٹم" دے رہے ہیں —— فرماتے ہیں ؎

ممکن ہوا تو باندھوں گا الفاظ میں ان خیالوں کو
مگر پہلے تم اے لہرو کاٹ دو ان چٹانوں کو
پھر میں باندھوں گا الفاظ میں ان خیالوں کو
ورنہ میں نہ باندھوں گا الفاظ میں ان خیالوں کو

سمندر میں مدّ و جزر ہوتا ہی رہتا ہے - اب شاید "جزر" ہے - کیونکہ اگلے بند میں مصرعے سکڑنے شروع ہو گئے ہیں - فرماتے ہیں ؎

آہا اے ماہی گیر کے بچے
تو بلاتا ہے چلاتا ہے
اپنی ننھی بہن کو

اب غالباً مدّ ہے کیونکہ مصرعے اچانک لمبے ہونے شروع ہو گئے ہیں - فرماتے ہیں ؎

مگر سنتا ہے مجھ کو اے ماہی گیر کے بچے
تو چلاتا ہے تا تو کھیل سکے اس سے بیچ سمندر
اور وہ تھا ماہی گیر - اب تو بتا اے ماہی گیر کے بچے
ارے تو گاتا ہے بیچ سمندر لہروں میں

کاٹ دو کاٹ دو اے لہرو کاٹ دو
ورنہ میں نہ باندھوں گا الفاظ میں ان خیالوں کو ——

خاکسار اسی پہ اکتفا کرتا ہے ورنہ یہ نظم ملٹن کی "پیراڈائز لاسٹ (Paradise Lost) سے دو تین گنا طویل ہے - اسکے علاوہ اور نظمیں بھی ہیں جو "Paradise Regained" جتنی طویل ہیں مگر وہ اس وقت پیش نہیں کی جا سکتیں - میرے دوستوں کا خیال ہے کہ ان تمام مطبوعات کا مجموعہ پاکستان کے سفارت خانے کی معرفت "انڈیا آفس لائبریری" کو انگلستان بھجوا دینا چاہیئے - شاید ہمارے سٹاف کے کسی ممبر یا کسی ہونہار طالب علم کو ان پہ پی ایچ ڈی کرنے کا شرف حاصل ہو جائے - اسکے علاوہ کالج کو ایک اور مائیکرو خرید لینی چاہیئے تا لاہور کے مینٹل ہسپتال تک "فری سروس" جاری کی جا سکے ! +

پگڈنڈیاں

المنار کی اس اشاعت سے "پگڈنڈیاں" کے عنوان سے ایک مستقل فیچر کا آغاز کیا جا رہا ہے ہر انسان کی زندگی میں متعدد ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو قلب و ذہن پر گہرا نقش چھوڑتے ہیں جو نقش اتنا گہرا ہو کہ ایک عرصہ کے بعد بھی اس کی روداد صفحۂ قرطاس پر آجائے تو ایسے نقوشِ لازوال اس عنوان کے تحت المنار کی زینت بنیں گے۔ ادارۂ المنار طلباء کو اس امر کا یقین دلاتا ہے کہ اگر "راہی" مناسب "زادِ راہ" لے کر پگڈنڈیوں کی جانب قدم بڑھاتے رہے تو انشاء اللہ تعالیٰ یہ "پگڈنڈیاں" ہمیشہ ان کا ساتھ دیں گی اور اس رفاقت سے منزل کا طویل فاصلہ سمٹتا چلا جائے گا۔ (مدیر اعلیٰ)

نام نہاد تہذیب

موسم گرما کی تعطیلات گزارنے کے بعد میں واپس آرہا تھا۔ جب بس گوجرانوالہ پہنچی تو میرے عقب میں سیٹ بالکل خالی ہوگئی اتنے میں ایک طویل قامت شخص اس سیٹ پر آبیٹھا۔ لباس و وضع قطع سے کوئی مالدار زمیندار دکھائی دیتا تھا۔ عرفِ عام میں آپ اسے "بڑا" آدمی کہہ سکتے ہیں۔ بس چلنے میں ابھی کچھ دیر باقی تھی کہ ایک اور شریف صورت شخص بس میں داخل ہوا اور اس "بڑے" آدمی سے کہا کہ آپ ذرا پرے ہو جائیں تاکہ میں بھی بیٹھ سکوں۔ "بڑے" نے نہایت تحقیر آمیز لہجے میں کہا کہ تمام سیٹ میری ہے اس پر اس چھوٹے آدمی نے کہا کہ یہ سیٹ تو تین مسافروں کے لئے ہے اور آپ اکیلے بیٹھے ہیں۔ اتنی سی بات پر وہ "بڑا" آدمی سیخ پا ہو گیا اور چھوٹے آدمی کو باہر دھکیلنے لگا اور ساتھ ہی مدد کے لئے دو اور باہر کھڑے ہوئے مددگاروں کو بلایا۔ وہ بھی بس کے اندر گھس آئے اور اس چھوٹے آدمی کو گھسیٹ کر باہر لے گئے جہاں اس کی خوب ہی مرمت کی۔ وہ تو بھلا ہو لوگوں کا جنہوں نے بیچ میں آکر اس کی جان بچائی ورنہ وہ سنگدل تو کوئی کسر نہ چھوڑنے والے تھے۔ "بڑا" شخص بس میں بیٹھا ابھی تک بڑبڑا رہا تھا کہ "اس نے بدتہذیبی سے کلام کیا ہے، اس کم بخت کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں"۔

یہ واقعہ معمولی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِس کی قباحت شاید اِس وجہ سے بھی کم ہو کہ یہ ہمارے معاشرہ میں روز کا مشاہدہ بن چکا ہے لیکن مَیں اِس واقعہ سے اِس قدر متأثر اور متأسف ہوا کہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا ہمارے معاشرہ میں "بڑوں" کو اِس بات کی کھلی چھٹی ہے کہ وہ شریف النفس لوگوں کی عزتوں سے بلا وجہ کھیلنا شروع کر دیں۔ انہیں ملک و قوم کا کونسا قانون اِس امر کا مجاز قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی نام نہاد عزت پر حرف آنے کے موہوم اتفاق کا امکان پیدا ہوتے ہی معزز و شریف اور بے ضرر لوگوں کی عزت و ناموس پر بر سرِ عام دست درازی شروع کر دیں ——— یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس "بڑے" نے اپنی بڑائی کے نشہ میں ایک شریف آدمی کی بے عزتی محض اِس وجہ سے کر ڈالی کہ اُس نے سیٹ پر بیٹھنے کے اپنے جائز حق کا مطالبہ کیا تھا۔ کیا اپنے حق کا مطالبہ جُرم ہے جس کی پاداش میں ایک شخص کو اپنی عزت کا سودا چکانا پڑتا ہے؟ اس "بڑے" کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ نو وارد کا طرزِ تکلم غیر مہذبانہ تھا (اگرچہ حقیقت اس کے بالکل برخلاف تھی) تو کیا یہ اُس کا اپنا فرض نہ تھا کہ وہ دست درازی سے پہلے ایک ساعت کے لئے یہ سوچ لیتا کہ کیا میرا یہ فعل دائرۂ تہذیب کے اندر ہے؟

اِس واقعہ پر کافی عرصہ بیت چکا ہے لیکن اس کے نقوش آج بھی ذہن میں اسی طرح باقی ہیں۔ یہ سوال آج بھی میرے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں کہ کیا وہ "چھوٹا" آدمی جس کی عزت کو سرِ راہ خاک میں ملایا گیا آزاد مملکتِ اسلامیہ کا اُسی طرح کا معزز شہری نہیں تھا جس طرح کا وہ "بڑا" آدمی۔ اور کیا اس "چھوٹے" آدمی کا بھی بس پر اُتنا حق نہ تھا جتنا اُس "بڑے" آدمی کا؟ ÷

کاروباری ذہنیت

مَیں ریل گاڑی میں سوار سیالکوٹ جا رہا تھا، وزیر آباد کے سٹیشن پر مَیں نے ایک ہاکر سے اپنی پسند کا اخبار طلب کیا۔ وہ کہنے لگا "جی! وہ اخبار تو آیا نہیں، یہ دوسرا ہے لے لو"۔ مَیں نے یکلخت ہی انکار کر دیا اور وہ آگے چل دیا۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد پھر واپس آیا اور کہنے لگا "اچھا ——— تو پھر اپنی پسند کا ہی اخبار لے لو"۔ مَیں نے اخبار پکڑتے ہوئے اُس سے پوچھا کہ تم نے پہلے کس وجہ سے انکار کیا تھا؟ کہنے لگا "جی ——— ہمارا وہ اخبار بکتا نہیں اور یہ اخبار جلدی جلدی نکل جاتا ہے اِسی لئے انکار کر دیا تھا کہ شاید آپ مجبور ہو کر اسے ہی خرید لیں"۔

مَیں اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا لیکن کافی دیر تک یہ خیال میرے دماغ میں سمایا رہا کہ کیا تجارت اسی کا نام ہے؟ اور کیا محض چند پیسوں کی خاطر غلط بیانی ہی وہ طریق ہے جس کی اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے؟ یہ خیال کر کے سرِ ندامت

سے جُھک گیا کہ کاروباری ذہنیت کے نتیجہ میں بد دیانتی کا یہ رِستا ناسُور ہمارے معاشرہ میں اپنی مہلک جڑیں کتنی مضبوطی سے قائم کر چکا ہے۔

(محمود احمد وینس۔سالِ دوم)

ڈُوبتے دِل

معمول کے مطابق کہہ لیں یا یونہی سمجھ لیں مجھے ایک بار ایک ہسپتال میں جانے کا اتفاق ہُوا۔ ہسپتال کے وارڈ میں مختلف مریض کراہ رہے تھے۔ بعض دم سادھے پڑے تھے۔ اُن میں سے بعض حادثات کے مریض تھے اور بعض متعدی بیماریوں کے! حادثات کے مریضوں میں میرا بھی ایک دوست تھا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ ماحول پر نگاہ دَوڑائی تو تقریباً ہر مریض کے پاس ایک یا دو پُرسانِ حال بیٹھے نظر آئے لیکن اُن میں سے چند مریض ایسے بھی تھے جن کے پاس کوئی نہ تھا۔ ان میں سے ایک غمگین، اُداس اور حسرت بھری نگاہوں سے آنے جانے والوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اُس کے دل کی کیفیت کو بھانپ گیا اور اُس کے قریب جا بیٹھا۔ اُس کا دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ میں اُس کے ساتھ اُس کی بیماری اور اس کے خاندان کے متعلق بیٹھا گفتگو کرتا رہا یہاں تک کہ اُسکے چہرہ سے غمی اور اُداسی کے بادل چھٹ گئے اور وہ جو اپنے آپ کو اِس بھری دنیا میں تنہا اور بے آسرا محسوس کر رہا تھا میری اِس رسمی گفتگو سے خوش ہو گیا۔ اُس کے اُداس چہرہ پر خوشی کی لہر دَوڑ گئی۔

میں ہسپتال سے واپس آتے ہوئے سارا راستہ یہ سوچتا رہا کہ ہسپتالوں میں روزانہ ایسے کتنے مریض آتے ہونگے جن کا اِس دنیا میں کوئی بھی پُرسانِ حال نہیں اور کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو چند لمحے ان سے محبت و ہمدردی کے ساتھ باتیں کر کے اُن کا غم غلط کر سکے۔ میں سوچتے سوچتے بہت دُور نکل گیا کہ ہمارے معاشرے میں آج کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو اس بات کا بھی علم نہیں کہ مریض کی عیادت کس قدر ثواب کا موجب ہے۔ اور پھر کتنے ہیں جو اپنی کھیل کُود کے وقت میں سے چند لمحات ان لاچار اور نادار مریضوں کی عیادت کی خاطر وقف کرنے کو تیار ہیں؟

اِن ڈُوبتے دلوں کو سہارا دینے کے لئے کسی خطیر رقم کی ضرورت نہیں بلکہ محبت و پیار اور ہمدردی کا سے دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے چند جملے ہی ان کی بیماری کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔ آہ! اِس دنیا میں کتنے ایسے مریض ہوں گے جن کی آنکھیں کسی ہشاش بشاش اور خلوص بھرے چہرے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی بند ہو جاتی ہیں۔

(انعام اللہ ہاشمی۔ بی اے۔سالِ دوم)

ذاتی مُعاملہ

وہ ہمارے گاؤں کا ایک اچھا تعلیمیافتہ نوجوان تھا ـــــ دو سال قبل اُسے ایک اچھی خاصی ملازمت ملی۔ مَیں اُسے اُسکے دفتر گیا وہ بڑے تپاک سے مجھے ملا اور اپنے ماتحتوں سے اُس نے میرا تعارف کروایا ـــــ مجھے اسکے پاس بیٹھے ابھی چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک میلے سے کپڑوں میں ملبوس دیہاتی سر پر گھی کا کنستر اٹھائے دفتر میں آ پہنچا۔ اُس دیہاتی نے سب کو سلام کیا ـــــ مگر سب بڑی حیرانگی سے اُسے دیکھ رہے تھے اور سب سے زیادہ گھور کر دیکھنے والا وہ نوجوان تھا جسے مَیں ملنے گیا تھا ـــــ میرے سوا سب کی آنکھوں میں حقارت جھانک رہی تھی ـــــ لیکن مَیں یہ سوچ رہا تھا کہ اب آگے کیا ہوگا کیونکہ وہ دیہاتی میرے میزبان کا باپ تھا ـــــ نوجوان کے ماتحتوں نے اُس سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے؟ ـــــ اُس نے جواب دیا ہمارے گاؤں کا ایک ادنےٰ آدمی ـــــ دیہاتی یہ سُن کر غصہ میں بڑبڑاتا ہُوا باہر چل دیا ـــــ مَیں نے ایک غصہ بھری نظر اُس نوجوان پر ڈالی اور اُس بوڑھے دیہاتی کے پیچھے بھاگا تاکہ اُس کے دل کو تسلی دوں ـــــ وہ نوجوان میرے تعاقب میں آیا اور مجھے پکڑ کر غصے سے کڑک کر بولا ـــــ "تم ہرگز میرے ذاتی معاملہ میں دخل نہ دو ـــــ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔" ـــــ اور اتنا سُن کر مَیں یہ سوچتا ہُوا ایک اور سڑک کی طرف چل دیا کہ کتنے ہی ذاتی معاملوں میں غیر ذاتی سلوک پرورش پا رہا ہے ٭ (عبدالشکور اظہر بی۔ اے)

"جدّت"

چند دنوں کی بات ہے صبح سات آٹھ بجے کا وقت ہوگا ہمارے مکان پر آکر ایک بھکارن نے خیرات کے لئے صدا دی۔ یہ بھکارن ہر دوسرے تیسرے دن اِسی طرح آکر گھر گھر سے خیرات طلب کرتی، جو کچھ ملتا لیکر چلی جاتی۔ بعض بھکاریوں نے تو غالباً "رُوٹ" مقرر کئے ہوتے ہیں جو بڑی باقاعدگی سے ہر روز دن چڑھتے ہی اپنی "سروس" شروع کر دیتے ہیں اِسی وجہ سے کبھی کبھی یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے پیشہ ور بھکاریوں کو خیرات دینا کہیں ان اچھے بھلے لوگوں کو معاشرہ کا عضوِ معطّل بنانے کے مترادف نہ ہو۔ آج جب وہ بھکارن آئی تو میری چھوٹی بہن نے اسی خیال سے اسے خالی ہاتھ واپس کرنا چاہا۔ مَیں اندر بیٹھا اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ جب بھکارن کو جانے کے لئے کہا گیا تو وہ بڑے اعتماد سے بولی :۔ "بی بی پتہ بھی ہے آج رات مَیں نے خواب میں دیکھا ہے کہ مَیں تمہارے گھر آئی ہوں اور تم نے مجھے کافی ساری خیرات دی ہے۔"

خیرات مانگنے کے اِس "جدید حربہ" کو سُن کر مَیں اس سوچ میں گم ہوگیا کہ "جدّت" کہاں کہاں نہیں پائی جاتی۔ ہر شخص اپنا اُلّو سیدھا کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے نئے سے نئے حربے تلاش کرتا ہے ٭

(نثار احمد بسرا۔ بی۔ اے، سالِ اوّل)

دام خیال

• سعید انجم

• صداقت علی

• وہاب اشرفی

سعید انجم

کالی پینٹ، سفید قمیص، سفید ساڑھی، کالا بلاؤز

"گجرے، پھول اور ہار" گلی میں سے آواز سنائی دی۔

"سلیم!" ساتھ ہی سلیم کو اُس کی باجی کی آواز سنائی دی۔

"دیکھو بھیا جلدی گجرے اور ہار لے آؤ۔ بابا گزر نہ جائے کہیں"۔ سلیم کو سامنے دیکھ کر شمیم نے کہا۔ اُسے ڈر تھا کہیں وہ گزر نہ جائے۔ اُن کی گلی میں پھول بیچنے والا صرف ایک ہی آدمی جو آیا کرتا تھا۔

"لو باجی ابھی لو" سلیم نے سلیپر پہنتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی کھڑکی میں سے سر نکال کر آواز دی۔

"ٹھہرو بابا" خود سیڑھیاں اُترنے لگا۔

شمیم بھاگتی ہوئی سلیم کے پیچھے سیڑھیوں میں آئی اور سلیم کو اُترتے اُترتے ایک اور ہدایت سُنا ڈالی۔

"پھول باسی نہ ہوں کہیں"

"بابا ہمائے پھول دیدو" سلیم نے جا کر کہا۔

پھولوں والے نے ٹوکری سر سے اُتار کر نیچے رکھ دی۔ یہ روزانہ آنے والا بابا نہ تھا لیکن ٹوکری وہی تھی۔

"کیا تم بابا کے بیٹے ہو؟" سلیم نے پوچھا۔

"ہاں۔ آج بابا بیمار ہے"۔ اکھڑے لہجے میں سلیم کو پھولوں والے سے جواب ملا۔

"اچھا پھر دو گجرے اور دو ہار دیدو" سلیم نے بتایا۔

سلیم کو دونوں چیزیں مل گئیں۔ "چھ آنے" پھولوں والے نے کہا۔

"کیوں بھئی؟ ہم تو روزانہ چار آنے میں لیتے ہیں" سلیم نے کہا۔

"جی نہیں، چار آنے میں تو ہمیں بھی نہیں پڑتے" پھولوں والے نے کہا۔

"لیکن بابا تو ہم سے چار آنے لیا کرتا ہے" سلیم نے بتایا۔

"تو میں کیا کروں"۔ وہ کچھ پروا نہ کر رہا تھا۔ "مجھے تو چھ آنے ہی چاہئیں" اُس نے کہا۔

"اچھا میں ابھی لایا" سلیم نے گجرے اور پھول ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا اور دھپ دھپ سیڑھیاں چڑھ گیا۔

"لاؤ نکالو باجی چھ آنے" سلیم نے اُوپر پہنچتے ہی کہا۔

"چھ آنے؟ وہ کیوں؟" شمیم نے حیرانگی سے پوچھا۔

"بابا خود نہیں ہے آج۔ اُس کا بیٹا بیچ رہا ہے اور وہ اتنے ہی مانگتا ہے" سلیم نے بتایا۔

"میرے پاس تو صرف چار آنے ہیں، دو آنے کہنا پھر لے جائے" شمیم نے کہتے ہوئے پھول سلیم کے ہاتھ سے پکڑے اور پھر اپنا بکس کھول کر بیٹھ گئی۔

"ارے یہاں مَیں نے رات کو چار آنے رکھے تھے" شمیم نے چونی کو اپنی جگہ سے غائب دیکھ کر کہا۔

"مجھے تو پتہ نہیں" سلیم نے کہا۔

"اچھا امّی سے پوچھتی ہوں"۔ شمیم یہ کہہ کر باورچی خانے میں چلی گئی جو اُن کا دوسرا کمرہ بھی تھا۔

"ارے بیٹی! وہ چونی تو مَیں نے ابھی صبح صبح دودھ والے کو دیدی تھی بہت لڑ رہا تھا بقیہ بارہ آنے مَیں نے کہا پھر لے جانا" شمیم کی والدہ نے کہا۔

"اب پھر پھولوں والے کو کیا جواب دینا ہے" شمیم نے پوچھا۔

"اُسے کہہ دو نا کل لے جائے، روز ہی تو لیتے ہیں اُس سے پھول۔ کہیں بھاگ تو نہیں جاتے اُسکے پیسے لیکر"

"آج بابا خود نہیں آیا اُس کا بیٹا ہے" شمیم نے دبے لفظوں سے ماں کو بتایا۔

"تو کیا ہے۔ جاؤ سلیم جاکر اُسے کہدو کل اسی گھر سے پیسے لے لے، کہیں بھاگ نہیں جائیں گے ہم لوگ" سلیم کی والدہ نے سلیم سے کہا۔

سلیم خاموشی سے سیڑھیاں اُتر گیا۔

"بھائی آج اتفاق سے گھر میں پیسے نہیں ہیں کل لے لینا" سلیم نے آہستہ سے جاکر کہا۔

"کیا؟" اُس نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"بھیا اِس وقت گھر میں پیسے نہیں ہیں تمہیں کل مل جائیں گے۔ بابا کو کہہ دینا کہ ۴ نمبر گلی کے چوبالے والوں نے گجرے اُدھار لئے ہیں کل پیسے دیدیں گے" سلیم نے دوبارہ کہا۔

"اگر گھر میں پیسے نہیں تھے تو پھول کیوں لے لئے۔ کل پیسے دیں گے تابس وقت پھول بھی اُسی وقت لے لینا۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو ہار واپس کردو میرے" پھولوں والے نے فیصلہ سُنایا۔

"مَیں نے تمہیں بتایا ہے نا ہم روز لیتے ہیں، بابا تمہیں کچھ نہ کہے گا" سلیم نے سمجھا شاید بابا کے ڈر سے نہیں دے رہا۔

"اونہہ، بابا مجھے کہہ بھی کیا سکتا ہے لیکن مجھے تو پیسوں سے غرض ہے اِس وقت۔ اگر پیسے نہیں ہیں تو ہار واپس

کردو میرے" پھولوں والے نے ذرا سختی سے کہا۔

سلیم نے جب دیکھا کہ وہ کسی طرح ڈھب میں نہیں آتا تو خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ گیا۔

"باجی!" سلیم نے ہولے سے پکارا۔

"کیا بات ہے سلیم؟" باجی نے پوچھا۔

"باجی وہ نہیں مانتا" سلیم نے بتایا۔

"کیا نہیں مانتا؟" شمیم نے پوچھا۔

"کہتا ہے پھول واپس کردو" سلیم نے بتایا۔

"ہیں" شمیم نے ایک آہ کے ساتھ کہا۔

"ہاں ہاں باجی بہت گرم ہو رہا ہے وہ تو۔ کہتا ہے جب پیسے پاس نہیں تھے تو بلایا کس لئے تھا مجھے پیسوں سے غرض ہے اگر نہیں ہیں تو پھول واپس کردو" سلیم نے پھولوں والے کی باتیں دہرا کر کہا "واپس ہی کر دو باجی!"

شمیم نے حسرت کے ساتھ گجروں کی طرف دیکھا پھر اس کی نظر کلائیوں کی طرف پھیل گئی اور پھر وہ ایک سرد آہ کے ساتھ بولی "لے جاؤ پھر بھیا" ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

سلیم پھول لے کر نیچے اتر گیا۔

اگر باپ کی موجودگی میں کچھ مشکلات سے دوچار ہونا پڑے تو اُن کا مقابلہ نہایت خندہ پیشانی سے کیا جاتا ہے لیکن جب باپ فوت ہو چکا ہو تو ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات بھی دل کو ٹھیس پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ شمیم اپنے باپ کو یاد کرنے لگی۔ کاش وہ زندہ ہوتے تو یہ وقت نہ آتا لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ پھول واپس ہو گئے۔ سلیم پھول واپس کر کے آیا تو دیکھا شمیم وہیں بیٹھی ہوئی کلائیاں مروڑ رہی تھی۔ چند آنسو رخساروں پر لڑھک رہے تھے اور چند لڑھکنے کے لئے مچل رہے تھے۔

"باجی!" سلیم نے قریب جا کر ہولے سے پکارا۔

شمیم نے بڑی بڑی آنکھیں اوپر کو اٹھا دیں۔

"آپ بھی یوں ہی ہیں۔ چھوٹی سی بات لے کر بیٹھ گئیں۔ کیا ہوا اگر اس گدھے نے پھول نہیں دیئے تو میں اپنی باجی کے لئے خود باغ میں جا کر پھول توڑ لاتا ہوں، مالی میرا واقف ہے" سلیم نے ہمدردی جتائی۔

سلیم باجی کے لئے ہار خود گوندلایا، ساتھ بہت سے پھول لایا۔ شمیم نے گجرے خود گوندلئے۔

★

"امی جی!" سلیم نے سیڑھیاں چڑھتے ہی کہا۔

"کیا بات ہے بیٹا" والدہ نے پُوچھا۔
"مَیں آج وحید کے گھر پارٹی میں چلا گیا تھا" سلیم نے بتایا۔
"اچھا" خوشی سے اُس کی والدہ بولی "تم تو کپڑوں کی وجہ سے انکار کر رہے تھے"۔
"وہی تو آپ کو بتانے لگا ہوں کہ کپڑوں کا انتظام ہو گیا تھا" سلیم نے کہا۔
"کیا؟ سلیم کی والدہ نے حیرانی سے کہا۔
"کپڑوں کا انتظام خود ہی ہو گیا تھا امی جان۔ مَیں اختر کے گھر چلا گیا اُس نے وہاں دعوت پہ جانا تھا۔ مجھے کہا تم بھی چلو۔ مَیں نے بتایا کہ مجھے تو یاد ہی نہیں تھا اور اب اتنا وقت نہیں ہے کہ کپڑے بدل سکوں اِس لئے تم جاؤ لیکن اس نے کہا کپڑوں کا کیا ہے میرے پہن لو، تمہارا دعوت میں جانا ضروری ہے۔ اِس طرح مَیں دعوت میں چلا گیا" سلیم نے پوری بات سُنا دی۔
"کسی کے کپڑے نہیں پہنا کرتے بیٹے" ماں نے نصیحت کی۔
"امی مَیں تو نہیں پہن رہا تھا اختر نے زبردستی پہنا دیئے" سلیم نے صفائی پیش کی۔
"اچھا خیر ہوا سو ہوا آئندہ احتیاط کرنا" ماں نے نصیحت کی۔
"امی!" سلیم پھر دوبارہ بڑے پیار سے پکارا۔
"ہوں"
"مجھے ایک کالی پینٹ اور سفید قمیص سلوا دیں نا۔ اختر کی پینٹ اور قمیص پہن کر مَیں نے آئینہ دیکھا تھا مجھے یہ دونوں کپڑے بہت اچھے لگے" سلیم نے خواہش کا اظہار کیا۔
"تم دونوں کو معلوم نہیں ایک دم کیا ہو گیا ہے" ماں نے پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔
"کیوں؟" سلیم نے پوچھا۔
"شمیم نے ایک ڈرامہ میں حصہ لیا وہاں وہ سفید ساڑھی اور کالا بلاوز پہن کر بہت اچھی لگ رہی تھی وہ بھی کہتی ہے وہ مجھے لے دیں اور اب تم کالی پینٹ اور سفید قمیص لے کر آ گئے ہو" ماں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر تم دونوں بچے ہوتے تب تو کوئی بات نہ تھی لیکن خود سمجھدار ہو کر تم دونوں ایسی اشیاء کا مطالبہ کر رہے ہو جو ناممکنات میں سے ہیں۔ گھر میں کھانے کو ہے نہیں اور تم ساڑھیوں اور پتلونوں کے خواب دیکھتے ہو"۔
سلیم سر جھکائے دوسرے کمرہ میں چلا گیا۔
شمیم بستر پہ اوندھی لیٹی ہوئی تھی سلیم نے قریب جا کر پکارا۔
"باجی!"

"کیا ہے ؟" شمیم نے ایک دم تصورات سے چونکتے ہوئے کہا۔
"کیا بات ہے باجی یوں لیٹی ہو؟" سلیم نے پوچھا۔
"کچھ نہیں یونہی" شمیم نے جواب دیا۔
"کچھ تو ہے" سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا سوچ رہی تھیں آپ ؟"
"بھئی میں نے کیا سوچنا ہے" باجی نے کہا۔
"میں بتاؤں آپ کیا سوچ رہی تھیں" سلیم بولا۔
"ہاں بتاؤ" باجی نے اجازت دیدی۔
"آپ تصور ہی تصور میں ساڑھی پہنے ہوئے تھیں" سلیم نے بتایا۔
"کیا؟" شمیم نے ایک دم پوچھا۔
"سفید ساڑھی کالا بلاؤز" سلیم نے کہا۔
"تمہیں امی نے کہا ہوگا" شمیم نے خیال ظاہر کیا۔
"امی نے کہا تو تبھی مجھے پتہ چلا ورنہ آپ نے تو مجھ سے کہا نہیں"
"چلو اب جو کہتی ہوں"
"کیا ؟"
"یہی کہ بھیا مجھے سفید ساڑھی اور کالا بلاؤز لا دو نا! مجھے بہت پسند ہے یہ لباس" شمیم نے لجاجت سے کہا۔
"پیارے بھیا بڑے اچھے ہو تم" پھر تعریف بھی کردی۔
"ضرورت کے وقت اچھا بن گیا ہوں نا" سلیم نے شرارت سے کہا۔
"مجھے تو ہر وقت ہی میرا بھیا اچھا لگتا ہے" شمیم نے کہا۔
"ہوں، ضرورت کے وقت ایسا ہی کہا جاتا ہے" سلیم نے ہنس کر کہا۔
"مجھ پر یقین نہیں ہے کیا ؟" شمیم نے پوچھا۔
"نہیں" سلیم نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔
شمیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔
سلیم بھی پیچھے پہنچا۔ شمیم نے آنکھوں پر بازو رکھا ہوا تھا۔
"باجی!" سلیم نے پکارا۔
شمیم نے کوئی جواب نہ دیا۔

"باجی!" اُس نے پھر پکارا۔
شمیم چارپائی پر بیٹھ گئی لیکن کوئی جواب نہ دیا۔
سلیم سے برداشت نہ ہوسکا، وہ آگے بڑھا اور بازو پکڑ کر ہٹا دیا۔
"میری باجی!"
باجی کی آنکھیں تر تھیں۔
"باجی! مَیں نے تو مذاق کیا تھا" سلیم نے کہا۔
سلیم نے دوبارہ بازو چہرے سے پرے ہٹایا۔ شمیم رو رہی تھی۔
"باجی! آپ تو یونہی چھوٹی چھوٹی باتیں لے بیٹھتی ہیں" سلیم نے شمیم کے سر کو بھینچ لیا۔
شمیم اور زیادہ رونے لگی۔
"دیکھو باجی نتیجہ نکلنے میں ابھی کافی وقت باقی ہے۔ مَیں ان دنوں میں سروس کر لوں گا پھر اپنی پیاری باجی کیلئے سفید ساڑھی اور کالا بلاوز لاؤں گا" سلیم نے سکیم بتائی۔
"نہیں تو" شمیم نے ایک دفعہ سر اوپر اُٹھا کر سلیم کے بازو پکڑتے ہوئے کہا۔
"واقعی سچ باجی" سلیم نے کہا۔
"نہیں نہیں، مَیں اپنے بھیا کو کہیں نہ جانے دوں گی" شمیم نے کہا۔
"ارے چھوڑو بھی" سلیم نے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔
"نہیں، واقعی مجھے ساڑھی وڑھی کی کوئی ضرورت نہیں ہے" شمیم نے کہا۔
"لو اِس سے کیا ہوتا ہے، یوں بھی تو فارغ ہوں کچھ کام کر لوں گا تو کیا ہے" سلیم نے کہا۔
اگلے ہی روز سلیم نصیحتیں کرتی ہوئی ماں اور روتی ہوئی بہن کو چھوڑ کر سروس کرنے چلا گیا۔

★

نوجوان لڑکیوں میں ایک عجیب بات یہ ہوتی ہے کہ جس چیز کی دُھن ہو جائے وہ ناجائز ہو یا جائز اس کو حاصل کرنا اپنی معراج فرض کر لیتی ہیں اور پھر اُسے مذہبی فرائض سے بھی زیادہ اہمیت دیتے ہوئے اُسی کے تصور میں شب و روز صرف کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ شمیم کو پھولوں کا شوق ہوا تو وہ ایک وقت کا فاقہ تو برداشت کر لیتی تھی لیکن کسی روز پھولوں کا ناغہ گوارا نہ کر سکتی تھی اور اب سفید ساڑھی اور کالے بلاوز کی دُھن اُسے ہر وقت سلیم کا انتظار کرواتی اور مختلف زاویوں سے آئینہ میں کھڑی ہو کر اپنے متعلق سوچتی کہ وہ سفید ساڑھی اور کالا بلاوز پہنے ہوئے اس طرح معلوم ہوگی کہ وہ ایک دیوی ہے، ایک پاکیزہ مجسمہ ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں سے بھی سفید ساڑھی اور کالے بلاوز ہی کی

باتیں کرتی۔

ایک روز اُس کی سہیلی ناہید اُس کے گھر سفید ساڑھی اور کالا بلاوز پہن کر آ گئی۔ شمیم نے اُس سے لیکر پہن کر دیکھا اور پھر بہت دیر اُسی کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ اور پھر جب ناہید جانے لگی تو سیڑھیوں سے نیچے ڈیوڑھی تک اُسے چھوڑنے گئی۔

ناہید کو الوداع کر کے تھکے تھکے قدموں سے اُوپر چڑھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی معلوم نہیں سلیم کب آئے گا، جب اس کی معراج پوری ہو گی کہ آخری سیڑھی پہ اُسے پھولوں والے کی آواز سُنائی دی، وہ جلدی سے مڑ کر نیچے بھاگی کہ بابا آگے نہ گزر جائے کہ اُس کا پاؤں اُلجھ گیا اور وہ سر کے بل لڑھک گئی۔ ماں چیخوں کی آواز سُن کر بھاگتی ہوئی آئی۔ شمیم کا سر گود میں لیکر بیٹھ گئی۔ سر جھک گیا تھا، آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں اِدھر اُدھر سے اور ہمسائیاں آ گئیں اور ایک بچہ ڈاکٹر کو بلا لایا۔

ماں نے جمع شدہ پونجی ڈاکٹر کے قدموں میں ڈال دی لیکن ڈاکٹر کی ڈاکٹری کچھ کام نہ آ سکی اور شمیم اپنی سفید ساڑھی اور کالے بلاوز کا انتظار کرتے کرتے اِس دنیا سے دُور، بہت دُور اُفق کے اُس پار چلی گئی جہاں نہ سفید ساڑھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے نہ کالا بلاوز مانگا جاتا ہے۔

ماں کو سلیم کا کچھ پتہ نہ تھا اور سلیم کو اِس بات کا علم بھی نہ ہو سکا کہ وہ جس کی ساڑھی خریدنے کے لئے پردیس گیا ہوا ہے وہ اس کا انتظار کرتے کرتے دنیا کی بندشوں سے آزاد ہو چکی ہے۔

★

گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ سلیم کا دل بھی اُسی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔ درخت، پہاڑ اور ٹیلے تیزی کے ساتھ پیچھے رہتے جاتے تھے اور سلیم کے دماغ میں بھی، ماضی کے واقعات اُجاگر ہو کر پیچھے رہتے جا رہے تھے۔ گاڑی آہستہ ہو رہی تھی۔ سلیم کی چیزیں جمع کرنے کی قوت تیز ہوتی جا رہی تھی۔ گاڑی رُک گئی اور سلیم نے کالی پلیٹ اور سفید قمیص کے ساتھ سفید ساڑھی اور کالا بلاوز خرید لیا۔ اُس نے بیگ گلے میں ڈالا، اٹیچی کیس اُٹھایا اور جانی پہچانی راہوں پر قدم اُٹھانے لگا۔ وہ جلدی سے گھر میں داخل ہوا، سیڑھیوں ہی سے آواز دی۔

"باجی!" کوئی جواب نہ ملا۔

"باجی!" اُس نے سیڑھیاں طے کر کے اُوپر جا کر کہا۔

کمرے میں سے ماں نکل آئی۔

"امی! میں آ گیا"۔ وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا، آگے بڑھا اور ماں سے لپٹ گیا۔

ماں نے بیٹے کو پیار کیا، چوما چاٹا لیکن آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔

"امی! کہاں ہے میری باجی؟ میں اُس کی ساڑھی لیکر آیا ہوں" سلیم نے کہا۔

ماں کی آنکھیں برسنے لگیں۔

"کہاں ہے امی باجی؟" ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سلیم آبدیدہ ہو گیا۔

"بیٹا تمہاری باجی اِس جہان سے چلی گئی۔"

"امی" وہ چیخا اور پھر ماں سے لپٹ گیا۔

"بیٹا وہ سیڑھیوں سے گر کر ابدی سکون حاصل کر کے ہمیشہ کے لئے ہم سے دُور چلی گئی۔ حوصلہ کرو۔ چھوٹے باغ کے گیٹ کے پاس اُس کی قبر ہے۔ کتبہ لگا ہوا ہے، جاؤ سلام کر آؤ۔" ماں نے کہا۔

سلیم نے بیگ اُتار کر زمین پہ مارا اور اٹیچی کیس رکھ کر بھاگا۔

"ٹھہرو سلیم میں بھی چلتی ہوں" ماں نے کہا۔

سلیم نے پرواہ نہ کی اور بھاگتا ہوا نکل گیا۔

گیٹ کے پاس اُسے اپنی باجی کی قبر پر کتبہ نظر آیا۔ وہ ڈھاڑیں مارتا ہوا رونے لگا۔

"باجی! پیاری باجی! دیکھو تمہارا بھیا آ گیا تمہاری ساڑھی اور کالا بلاوز لے آیا ہے۔" وہ روتے روتے قبر پہ بیٹھ گیا، قبر پہ ہاتھ پھیرنے لگا گویا باجی سے پیار کر رہا ہے۔ اُس کو اچانک پھول یاد آئے۔

"میری باجی، پھولوں کی رانی کی قبر پھولوں سے خالی؟" وہ بھاگتا ہوا پھولوں کے پودوں میں گھس گیا۔ بے تحاشا پھول توڑنے لگا، جھولی بھرنے لگا۔ ایک جگہ اُسے ایک بہت بڑا گلاب کا پھول نظر آیا وہ اس کی طرف بڑھا۔ جھاڑی میں سے پھنکار کی آواز سُنائی دی۔ وہ تو دیوانہ ہو رہا تھا اُس نے آگے بڑھ کر پھول توڑ لیا لیکن ظالم سانپ اُسے ڈس چکا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا اور قبر پہ پھول ڈھیر کر دیئے۔ "دیکھو باجی اب آرام پاؤ، کیا ہوا اگر اُس گدھے نے پھول نہیں دیئے میں خود تو اپنی باجی کے لئے پھول لے آیا ہوں۔ اُٹھو باجی گجرے گوندلو۔ باجی ـــــ باجی"۔ وہ بے کل ہو کر گر پڑا۔ زہر اپنا کام کر چکا تھا۔

ماں بھی سلیم کے پیچھے آ رہی تھی، وہ اپنے بیٹے کے جسم کو ٹھنڈا دیکھ کر چیخ پڑی نبضیں ٹٹولیں لیکن نہ مل سکیں اور پھر بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اُس وقت سلیم اور شمیم اکٹھے ہو چکے تھے۔ ماں روتی دھوتی گھر چلی گئی۔ ماں نے گھر جا کر اٹیچی کیس کھولا تو اُس اس میں سے سفید ساڑھی اور کالے بلاوز کے ساتھ کالی پینٹ اور سفید قمیص کا کپڑا بھی نکلا۔ اگلے روز جب سلیم کی قبر بن چکی تو وہ اٹیچی کیس لیکر قبرستان چلی گئی۔ اُس نے شمیم کی قبر پر سفید ساڑھی چڑھا دی اور سلیم کی قبر کو کالی پینٹ کے کپڑے سے ڈھک دیا اور پھر تھوڑی دیر سوچ کر دونوں کتبوں پر سفید قمیص اور کالا بلاوز ڈال کر واپس چلی گئی۔ +

صداقت علی
سالِ دوم (فنون)

آہ یہ دُنیا!

آج محمود فاروقی کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ لوگوں نے اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی۔ ابھی ابھی ڈاکٹر نے اس کو ٹی بی کے لاعلاج مریضوں کے وارڈ میں داخل کیا تھا۔ شاید اس کے لبوں پہ مسکراہٹ اسلئے تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ وہ اِس ظالم دنیا سے ہمیشہ ہمیش کے لئے رخصت ہو رہا ہے جہاں اُسے ٹھوکروں کے سوا کچھ نہ مل سکا۔ جہاں کے بسنے والے کسی کے ٹوٹے دل کو جوڑنا اپنے لئے گناہِ کبیرہ سمجھتے ہیں۔ جہاں مظلوم کی آہ کا تمسخر اُڑایا جاتا ہے۔ جہاں انسانیت کے ساتھ مذاق کرنا اپنے لئے کارِ خیر سمجھا جاتا ہے۔

محمود خوشی سے معمور اپنی کار چلاتا ہوا گھر پہنچا۔ آج اس کا نتیجہ نکلا تھا۔ وہ اپنے کالج میں فرسٹ پوزیشن حاصل کر کے بارھویں جماعت میں کامیاب ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ یہ خبر اپنے ابّا طارق فاروقی کو جلد از جلد سُنائے۔ لیکن وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ محمود ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنے ابّا جان کا انتظار کر رہا تھا کہ نوکر نے آکر کہا "جناب کھانا لگا دوں"

"نہیں نہیں، آج میں کھانا ابّا جان کے ہمراہ کھاؤں گا۔"

طارق فاروقی کو کافی دیر ہو گئی تھی لیکن ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ محمود بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اُس کی نظر بار بار گھڑی کی طرف اُٹھ رہی تھی۔ اتنے میں گھنٹی بجی۔ محمود نے نوکر کو آواز دی لیکن پھر کچھ سوچتے ہوئے خود ہی دروازہ کی طرف گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص جس کی شکل اِس بات کی غمّازی کرتی تھی کہ وہ کوئی بُری خبر لے کر آیا ہے اُسکے سامنے کھڑا ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ محمود کو غصّہ آگیا اور بولا "بولتے کیوں نہیں، چُپ میرا مُنہ کیوں تک رہے ہو"۔ وہ شخص بڑی غمناک آواز میں بولا "بڑے افسوس کے ساتھ یہ بُری خبر آپ تک پہنچاتا ہوں کہ آپ کے والد صاحب جب گھر آرہے تھے تو بدقسمتی سے اُن کی کار اور ایک بس کی ٹکر ہو گئی۔ جس کی وجہ سے وہ شدید زخمی ہو گئے اور اب وہ میونسپتال میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

یہ خبر محمود کے لئے ایک بم پھٹنے سے کم نہ تھی۔ وہ فوراً ہسپتال پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ اُس کا والد بے ہوش ایک لاش کی مانند پڑا ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ آپ ہوش میں آرہے ہیں لیکن بچنے کی اُمید بہت کم ہے۔ اتنے میں ان کو ہوش آگیا۔ جب انہوں نے محمود کی طرف دیکھا تو مسکرائے۔ پھر اُن کے ہونٹ ہلے لیکن آواز نہیں آرہی تھی۔ محمود اپنا کان اُن کے مُنہ کے قریب لے گیا لیکن افسوس کہ اتنی دیر میں اُن کی رُوح محمود کو اِس بھری دُنیا میں بے یار و مددگار چھوڑ کر قفسِ عنصری سے

پرواز کر چکی تھی۔

طارق فاروقی کو اپنے بیٹے سے بہت محبت تھی، وہ اُس کے ہر آرام کا خیال رکھتے تھے۔ محمود کی والدہ جب اُس کو ڈیڑھ سال کا چھوڑ کر اِس دنیا سے چل بسی تھیں تو اُس کے والد نے اپنے اکلوتے بیٹے کی پرورش اِس قدر محبت سے کی تھی کہ اس کو والدہ کی کمی کا احساس بھی نہ ہونے دیا تھا۔ اب یہ المناک واقعہ محمود کے لئے قیامت کا سماں پیدا کر گیا۔ وہ دن رات آنسو بہانے میں مصروف رہتا۔

ایک دن محمود کے ماموں اور ممانی اُس کے ہاں تشریف لائے اور اسے مجبور کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہاں اسکی بڑی خاطر تواضع کی جانے لگی۔ اس کے دو ماموں زاد بھائی اور ایک بہن تھی جنہوں نے اس کے زخمی دل پر ایسی مرہم رکھی کہ وہ چند دنوں میں اپنا غم بھول گیا۔ وہ محمود جو اپنے باپ کی وفات پر بالکل بدل چکا تھا، جس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی، جس کی آنکھیں ہر وقت نم آلود رہتی تھیں اب پھر ہنسی خوشی زندگی کے دن گزارنے لگا۔

ایک دن محمود باغ میں بیٹھا پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اُس کی خالہ زاد بہن نے آکر کہا کہ سب افرادِ خانہ اُس کا ناشتہ پہ انتظار کر رہے ہیں۔ محمود اُٹھا اور کھانے کے کمرہ میں چلا گیا۔ وہاں سب ہی موجود تھے۔ ناشتہ ختم کرنے کے بعد محمود نے اپنے آپ کو کچھ بوجھل سا محسوس کیا لیکن وہ اپنے اِس احساس کو سب سے چھپائے ہوئے وہاں بیٹھا رہا۔ جب اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی تو اُس کی ممانی نے چند کاغذات اُس کے سامنے رکھ کر کہا "بیٹا! اِن پر دستخط کر دو، تمہارے ماموں آج لاہور جا رہے ہیں وہاں تمہارے ابا کا حساب بھی چیک کرتے آئیں گے۔" محمود میں پڑھنے کی سکت نہ تھی اُس نے جلدی جلدی دستخط کر دیئے۔

محمود کو جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو بستر پر دراز پایا۔ وہ بہت ہی پریشان تھا کہ وہ اس جگہ کیسے ہے۔ اتنے میں اس کی ممانی اندر آئی اور کہنے لگی "تمہاری طبیعت ناشتہ کرنے کے بعد خراب ہو گئی تھی اور ہم نے تمہیں یہاں پہنچا دیا تھا۔" محمود مسکرا دیا۔

اُن کے رویّے میں تبدیلی آتی گئی۔ وہ محمود جسے پہلے ایک دیوتا کی طرح پوجا جاتا تھا اب اُسے دھمکیاں دی جاتی تھیں ..... ایک دن تو حد ہی ہو گئی کہ ممانی جان فرمانے لگیں "اِس طرح بیٹھے کب تک کام چلے گا۔ ہم بادشاہ تھوڑے ہی ہیں، کچھ کام بھی کیا کرو۔" یہ سُن کر محمود نے کہا "شکریہ! میرے پاس خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے، مجھے کیا ضرورت پڑی کہ میں کسی کا محتاج بنوں۔"

یہ سُن کر اُس کی ممانی بولی "یہ باتیں کسی اور سے جا کر کرنا۔ جو کچھ تمہارے پاس تھا وہ اب ہمارا ہے۔ جاؤ نکلو ہمارے گھر سے۔"

محمود جھڑکیوں اور دھمکیوں سے جھولی بھرے ہوئے گھر سے نکلا اب اس کا کوئی رہبر، رہنما یا مددگار نہ تھا اور

نہ کوئی غمگسار تھا جس کے پاس اپنے غموں کا اظہار کر سکے یا اپنی روداد غم سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر سکے۔ مزدوری وہ نہیں کر سکتا تھا، نوکری وہ کرنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسی شہر میں اس کے سینکڑوں نوکر ہوا کرتے تھے جو اب اس کی ہنسی اڑا سکتے تھے۔ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال بھی دراز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اب اس ظالم شہر سے ہی بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اس کو لاہور کے در و دیوار سے نفرت ہو گئی تھی۔

بالآخر محمود کراچی میں ایک بڑے تاجر کے ہاں اس کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ اس کی زندگی اب قدرے خوشگوار گزر رہی تھی۔

ایک روز محمود تاجر کے ہاں بیٹھا اپنے ماضی کے اوراق پلٹ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں زندگی کے نشیب و فراز کی تلخ و شیریں یادیں ابھر رہی تھیں کہ اتنے میں چند سپاہی تاجر کی کوٹھی میں آئے اور تاجر سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ اگر اجازت ہو تو ہم آپ کے پرائیویٹ سیکرٹری سے چند سوالات دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ تاجر نے کہا "بڑی خوشی سے"۔

پھر سپاہی محمود سے مخاطب ہو کر بولا

"آپ لاہور سے تشریف لائے ہیں اور آپ کا نام محمود فاروقی ہے؟"

"جی ہاں"

"آپ کے والد کا نام طارق فاروقی تھا؟"

"جی ہاں"

"اپنے والد کی وفات سے پہلے آپ کوٹھی 16S گلبرگ میں مقیم تھے؟"

"جی ہاں"

"آپ کے ماموں کا نام اکمل ہے؟"

"جی ہاں"

"آپ اپنے والد کی وفات کے بعد اپنے ماموں کے ہاں مقیم ہوئے تھے؟"

"جی ہاں"

"تو اس کا مطلب ہے کہ آپ $12\frac{3}{59}$ کو اپنے ماموں کے ہاں سے بیس ہزار تین سو پندرہ روپے لے کر فرار ہوئے ہیں۔"

یہ سُن کر محمود کی ایک آہ نکلی اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ سپاہی سمجھے کہ یہی اصل ملزم ہے جو اپنی گرفتاری کے خوف سے بے ہوش ہو گیا ہے۔

محمود کو ہوش میں لایا گیا اور اگلے لمحے وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے قید خانہ میں پڑا تھا۔

تاجر یہ سُنکر کہ یہ طارق فاروقی کا لڑکا ہے بہت ہی حیران ہُوا۔ وہ سوچنے لگا وہی طارق فاروقی جس کی وجہ سے وہ اِس مقام پر پہنچا ہے، اس کا دوست، رہبر اور محسن طارق فاروقی جس سے اس نے کئی بار مدد بھی لی تھی، جس نے بارہا میرے لڑکھڑاتے قدموں کو سہارا دیا تھا آج اسی محسن کا لڑکا میرے سامنے سوالات کا مُنہ دیکھ رہا ہے۔ اِن خیالات سے اُسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ اُٹھا اور جاکر محمود کو ضمانت پر رِہا کروا دیا۔ مقدمہ چلتا رہا۔ محمود کے کمزور دلائل اُسے بَری نہ کروا سکے۔ چنانچہ عدالت کی طرف سے اُسے رقم واپس کرنے کا حکم ملا۔ محمود کے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہ تھا جو وہ ادا کر سکتا۔ رحمدل تاجر نے وہ رقم بھی ادا کر دی اور اُسے بیٹوں کی طرح رکھنے لگا۔

لیکن محمود کے شکستہ اور مغموم دل پر کوئی مرہم بھی کارگر ثابت نہ ہوئی۔ اُس کی صحت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ تاجر نے کافی علاج کروایا لیکن کوئی افاقہ نہ ہُوا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ اسے تپدق ہو گئی ہے۔ اُسے ہسپتال داخل کروا دیا گیا۔

وہ آج خوش تھا کہ شاید اُس کی زندگی کی کوئی صورت نکل آئے لیکن بے سُود۔ چند ہی دنوں میں وہ ظالموں اور سنگ دلوں کی اِس دنیا سے مُنہ موڑ کر اپنے ابّا کے گلے جا لگا۔

ہسپتال کے ٹی بی وارڈ میں ایک لاوارث لاش پڑی تھی جس کا اِس دنیا میں کوئی نہ تھا ـــــ ایک سرد لاش ـــــ جو ایک لمبا عرصہ اہلِ دنیا کی ٹھوکریں کھاتی رہی لیکن دنیا والے اُسے سنبھالا نہ دے سکے ـــــ آہ یہ دنیا!

ہمارا کالج ـــــ مولانا صلاح الدّین مرحوم کی نظر میں!

"میرے نوجوان دوستو! آپ کی تیسری خوش بختی یہ ہے کہ آپ نے جس ادارے میں تعلیم پائی ہے وہ دنیا میں دین کے امتزاج کا ایک نہایت متوازن تصور پیش کرتا ہے۔ نہ صرف پیش کرتا ہے بلکہ اسے عملِ مسلسل میں ملبوس بھی کرتا چلا جاتا ہے۔ خدا وہ دن جلد لائے جب ہم اِس کالج کو ایک معیاری، مکمّل اور منفرد کلّیہ کی حیثیت و صورت میں دیکھ سکیں اور کوئی وجہ نہیں کہ جہاں کام کو کام نہیں بلکہ ایک مشن تصوّر کیا جاتا ہے، جہاں طلبہ کو صرف پڑھایا نہیں جاتا بلکہ اُن کے مزاجوں میں ایک کوہ شکن سنجیدگی اور کردار میں ایک شریفانہ صلاحیت پیدا کی جاتی ہے اور جہاں اساتذہ کی قربانیاں اور جانفشانیاں اپنے پیچھے ایک کہکشانِ نُور چھوڑتی چلی جاتی ہیں وہاں اہلِ خیر کی تمنائیں کیوں نہ فروغ پائیں گی اور اہلِ علم کے عزائم کیوں نہ پورے ہوں گے۔"

(خطبۂ صدارت بر موقع سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات ۱۹۶۳ء)

وہاب اشرفی

آخری لاش!

شاہ اللہ رکھو نے آج بہت ہی تھکاوٹ محسوس کی۔ اُس نے جھُرلیوں سے بھرے اور گرد سے اَٹے چہرے کو مَیلے کُرتے سے پونچھتے ہوئے حمیدہ کو آواز دی۔ ....

حمیدہ کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آگئی۔ اُس نے باپ سے روپے لئے اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف مُڑ گئی۔ شاہ اللہ رکھو اپنی بیٹی کی صحت مند پُشت زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ اُس نے نظریں پھیر لیں۔ یکایک اُسے پھر اپنے جسم کی تھکاوٹ کا احساس ہُوا اور معًا اس کا دھیان اپنے سراپا پر گیا۔ کبھی کا کسرتی بدن جہاں تہاں سے خم کھا گیا تھا۔ چوڑا چکلا سینہ اب محض ہڈیوں کا پنجرا اور مضبوط باہوں میں رعشہ تھا۔ شاہ اللہ رکھو نے یکبارگی یہ محسوس کیا کہ وہ اب بہت بوڑھا، کمزور اور لاغر ہو گیا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے بہت سی قبریں گھُوم گئیں .....

خام قبریں!

پختہ قبریں!!

وہ بوسیدہ سی ٹوٹی پھوٹی چٹائی پر بیٹھے ہوئے ماضی کے دُھندلکوں میں کھو گیا۔ بچپن اور جوانی کی رنگین اور دلکش یادوں کے بعد ہی اُس کے ذہن میں قبروں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اُس نے حساب لگایا کہ وہ آج چالیس سال سے موت کے بھیانک رقص میں شریک ہے۔ قبرستان ہی کی زمین میں اُس کی کارگزاریاں دفن ہیں۔ وہ آج تک قبریں کھودتا رہا ہے۔ اُسے گورکنی ورثہ میں ملی تھی اور آباؤ اجداد کے اِس پیشے کو وہ بحسن و خوبی انجام دیتا چلا آرہا ہے۔ پھر اُسے اپنے والدین یاد آئے۔ کتنے عرصے سے وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ چاہتا ہے کہ اُن کی خام قبریں پختہ ہو جائیں مگر گھر کے اخراجات آڑے آجاتے ہیں۔ حیف اِس بے چارگی پر!

شاہ اللہ رکھو کے ذہن کے کسی گوشے سے ایک پُرانی آرزو اُبھری —— جب اُس کی بیوی حیات تھی تو وہ کتنی آس لگائے بیٹھا تھا کہ اللہ اُسے چاند سا بیٹا دے گا۔ لیکن یہ آرزو پوری ہونے سے پہلے ہی وہ خود اللہ کو پیاری ہو گئی۔ سوچتے سوچتے شاہ اللہ رکھو کا ذہن بھٹک سا گیا۔ پھر حمیدہ کی زندگی پر آکر ٹھہر گیا۔

اب زمانے کا کیسا چلن ہے بیٹی کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ محض جہیز کے سامان سے کام نہیں چلتا۔ نقد رقم لڑکے والوں کو دینی پڑتی ہے۔ حمّو کیسی پیاری اور سنجیدہ لڑکی ہے، کیسی تندرست اور خوبصورت، اور کیا چاہیئے اُس کے سُسرال کے لوگوں کو لیکن زمانے کے چلن کو کیا کہا جائے سمدھی میاں شاہ رسول والے پانچ سُو روپے لئے بغیر حمّو کی رخصتی پہ آمادہ نہیں، پُورے تین برس ہو گئے نکاح کو۔ نہ پانچ سو روپے ہوئے نہ رخصتی ہوئی۔ شاہ محمد دین بابو تو میری حالت سے واقف ہیں، حمّو تو ان کی شرعی بیوی ہے لے جائے اپنے گھر۔ مگر کاہے کو۔ وہی ضد ہے رقم کی! بیچاری حمّو!! شاہ اللہ رکھو سوچتے سوچتے ایک دم گھبرا گیا اور پھر اپنی بیٹی کو پکارا "حمّو بیٹی! ذرا ڈبّہ تو لانا، پیسے گن لوں، آخر اب پانچ سو روپے میں کتنے باقی رہ گئے ــــ"

اور اس رات شاہ اللہ رکھو دیر تک نہ سو سکا۔ اب پُورے تین سَو اسّی روپے اُس کے پاس تھے۔ پانچ سَو روپوں کی منزل کچھ بہت دُور نہ تھی۔ بس دس بارہ قبروں کی کھُدائی سے کام چل سکتا تھا۔ اس کے دل کے گوشے میں یکایک ایک خواہش اُبھری کہ یہ دس قبریں ابھی ابھی کھُد جائیں۔ اس خیال کے ساتھ اس کے ضمیر کو ایک چوٹ سی لگی، اتنی قبریں تو اتنے آدمیوں کی موت کے بعد ہی بن سکتی تھیں۔ لیکن حمّو کے ہاتھوں کی مہندی کی سبیل تو یہی قبریں ہیں۔ پھر شاہ اللہ رکھو کو نیند آگئی۔ اُس نے دیکھا کہ دروازے پر گھٹیا چمار کی ٹولی شہنائی بجا رہی ہے۔ گورکنوں کی پوری آبادی بچھائی پر بیٹھی حمّو کی برات کا انتظار کر رہی ہے۔ جوان، بوڑھی عورتیں ڈھولک پر گیت گا رہی ہیں، اس کے بعد برات بھی آگئی۔ شاہ اللہ رکھو نے جلدی سے پانچسو روپے سمدھی میاں شاہ رسول کے ہاتھ پر گن دیئے اور اب بیٹی رخصت ہونے لگی۔ اچانک اِس مسرّت کے عالم میں ایک کسک سی اُس کے دل میں محسوس ہوئی۔ بیٹی کا بوجھ تو ہلکا ہو رہا تھا۔ سینے پر رکھی بلّی تو اُٹھ رہی تھی لیکن گھر محض حمّو کی وجہ سے آباد تھا، وہ اس کی رخصتی کے ساتھ اُجاڑ ہو رہا تھا، ویران ہو رہا تھا۔ شاہ اللہ رکھو نے دیکھا کہ بیٹی رخصت ہوتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رو رہی ہے۔ اُس کی آنکھیں پہلے تو نم ہوئیں پھر وہ جذباتی ہو گیا، بالکل جذباتی۔ اور حمّو کو ضروری نصیحتیں کرتے ہوئے اپنی آنکھوں کے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ بچّوں کی طرح بِلک پڑا۔ پھر زور زور سے رونے لگا۔ روتے روتے اُس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اُس نے دیکھا وہ چارپائی پر پڑا خوابوں کی دنیا میں ہے۔ اُس نے توبہ استغفار کیا لیکن وہ اپنے خیالات کو نہ جھٹک سکا اور حمّو کی رخصتی کے بارے میں سوچنے لگا۔

گرمی کے دنوں میں تو شہروں میں ہیضہ پھیلتا ہی ہے، کیا اِس سال ایسا نہ ہوگا؟ لیکن ہیضہ ایک بھیانک بلا ہے۔ کتنوں کے گھر اُجڑ جاتے ہیں۔ کتنوں کی مانگ کا سیندور مٹ جاتا ہے۔ نہیں، ایسا نہ ہو تو اچھا ہے لیکن ایسا ہو جائے تو حمّو کی رخصتی ہو جائے۔ پھر شاہ اللہ رکھو کو گہری نیند آگئی۔

اور ہوا یہ کہ شہر میں ہیضہ کی وبا پھیل گئی۔ شاہ اللہ رکھو اپنے بُرے خیالات پر خفیف ہو رہا تھا، لیکن ایک دن میں تین موتیں ہو گئیں اور اُسے ایک ہی دن میں تیس روپے مل گئے۔ شاہ اللہ رکھو کی مسرّت میں غم کا ایسا امتزاج تھا

کہ نہ وہ خوش تھا نہ غمگین ——— لاشے اُسے غمگین بناتے اور روپوں کی جھنکار میں اُسے شہنائی کی گونج سُنائی دیتی تھی اور اس طرح وہ غم و انبساط کے دوراہے سے گزر رہا تھا۔ اُس کے پاس اب چار سو نوّے روپے تھے اور اُس رات وہ رات بھر نہ سو سکا۔ صرف دس روپے کی ضرورت تھی، ایک لاش کی بات تھی۔

پھر صبح ہو گئی۔

ایک جنازہ دُور سے جھلک گیا۔

شاہ اللہ رکھو گھر کے اندر داخل ہو گیا اور حمّو کو بڑے جذباتی انداز میں پیار سے دیکھ کر کہا۔ "بیٹی! تیرے بُرے دن دُور ہوئے، تیری برات اب آ ہی چلی"۔ حمّو تو کچھ نہ سمجھ سکی۔ شاہ اللہ رکھو نے اپنے کُدال پھاؤڑے کو سنبھالا اور باہر نکل آیا۔

جنازہ قریب آ گیا تھا۔

بالکل قریب!

اُس کے سمدھی میاں شاہ رسول ایک چیخ کے ساتھ اُس کے گلے سے لپٹ گئے۔ شاہ اللہ رکھو کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ——— کُدال اور پھاؤڑے زمین پر گر پڑے۔!! (ماخوذ)

- "مَیں نے آج تک کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو صبح جلدی اُٹھتا ہو، محنت کرتا ہو اور ایمان داری سے رہتا ہو اور پھر بھی بدقسمتی کی شکایت کرتا ہو ——— (ایڈیسن)
- سُکھ کی تلاش کرتے وقت آدھی دنیا غلطی کرتی ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ خود کچھ پانے اور دوسروں سے خدمت کرانے ہی میں سُکھ ہے۔ حالانکہ سُکھ دوسروں کو کچھ دینے اور ان کی خدمت کرنے ہی میں ہے۔" (ہینری ڈرمنڈ)
- عقل کی حد ہو سکتی ہے لیکن بے عقلی کی حد نہیں" ——— (ایمرسن)
- یہ غلط ہے کہ وقت گزر جاتا ہے وقت ٹھہرا رہتا ہے۔ ہم گزر جاتے ہیں ——— (آسٹن ڈابسن)
- جس نے آپ کا وقت لیا ہے وہ خود کو آپ کا مقروض سمجھنے کے لئے تیار نہ ہوگا لیکن یہ ایک ایسا قرض ہے جو کبھی ادا نہیں ہو سکتا" ——— (سینیکا)

(مرسلہ قاضی منیر احمد مقیب)

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم!

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ٭ اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے!!

اُردو کے مشہور صاحبِ طرز ادیب، "ادبی دنیا" کے نہایت قابل ایڈیٹر جناب مولانا صلاح الدین احمد حال ہی میں انتقال فرماگئے ہیں۔ بابائے اُردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے سانحۂ ارتحال کے بعد مولانا کا انتقالِ پُرملال دنیائے اردو کا سب سے بڑا حادثہ ہے! اور اِس قحط الرجال کے دور میں یہ حادثہ اور بھی اندوہ ناک ہے! مولانا مرحوم ادیب اور علم پرور شخصیت ہونے کے علاوہ ایک نہایت ہی اچھے انسان بھی تھے۔ بڑے شفیق، بڑے ہی ملنسار!! مرحوم کو تعلیم الاسلام کالج اور اس کے وابستگان سے خاص محبت اور وابستگی تھی۔ جب بھی آپ کو یہاں تشریف لانے کی دعوت دی گئی آپ نے ہمیشہ بڑی مسرت اور بشاشت سے اسے قبول فرمایا۔ متعدد مرتبہ یہاں تشریف لاکر آپ نے اساتذہ اور طلبہ کو بڑے دلکش انداز میں اپنے قیمتی خیالات سے مستفیض کیا۔ مولانا مرحوم کو ہمارے کالج کے ماحول کی سادگی اور سنجیدگی اور اربابِ کالج کا خلوص بہت ہی پسند تھا اور آپ اکثر بڑی فراخ دلی سے ان عناصر کو سراہتے بھی تھے۔

جہاں تک مولانا مرحوم کی اُردو کے باب میں خدماتِ جلیلہ کا تعلق ہے وہ کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ اُردو کے فدائی خادم اور اُس کی ہمہ گیر ترقی کے پُرجوش متمنی تھے۔ عملاً اُردو ادب کے مزاج کی تہذیب میں آپ کی جدوجہد کا معقول حصہ ہے۔ اسکے علاوہ ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ زبانِ اُردو کے جدید علمی سرمائے میں اضافہ کرنے کے لئے آپ نے متعدد بلند پایہ انگریزی کتب کے نفیس تراجم کئے ہیں جو درحقیقت ایک بہت بڑی بروقت خدمت ہے۔ حال ہی میں مولانا کی خدمات کے اعتراف کے طور پر حکومت نے امتیازی تمغے کے علاوہ ایک معقول رقم بھی نذرانہ کے طور پر آپ کے لئے مخصوص کی ہے۔ افسوس کہ وہ اس اعزاز سے پہلے ہی انتقال فرماگئے!! —— ویسے انہیں اِس اعتراف کی پرواہ بھی نہ تھی —— وہ تو بے لوث خدمت کرنے والے اُن تھک وجود تھے!! انعام سے بے نیاز!! داد و دہش سے بلند، بہت ہی بلند!!

مولانا مرحوم کا انتقال ہم سب کے لئے بہت بڑا صدمہ ہے۔ اور تعلیم الاسلام کالج اور اس کے علم دوست اساتذہ، ادارۂ "المنار"، اولڈ بوائز اور طلبہ اِس دائمی مفارقت کو بڑے رنج اور قلق سے محسوس کر رہے ہیں۔ دعا ہے زبانِ اُردو خوب ترقی کرے اور تعلیمی، تہذیبی اور ادبی دنیا میں وہ مقام حاصل کرلے جس کا خاکہ مولانا مرحوم نے چشمِ تصور میں کھینچا تھا —— ورنہ اُن کی مضطرب رُوح بے چین رہے گی!!

(ادارہ)

شبستانِ غزل

- ثاقب نیروی
- عبدالسلام اختر
- نظر امروہی
- ارشد ترمذی
- بشارت جمیل
- عابد ربانی
- عبدالحمید عابد
- مجیب اللہ خان
- جاوید منگلوی
- قمر کاشمیری
- سمیع اللہ صادق

ثاقب زیروی
مدیر ہفت روزہ "لاہور"

خاص المنار کے لئے

زُلف کی مہک مانگیں - رُخ کی تازگی مانگیں
آؤ اِک مسیحا سے - ہم بھی زندگی مانگیں

تیرگی کے پردے میں اَن گنت ضیائیں ہیں
شب اگر مقدر ہے - اس کی چاندنی مانگیں

بے طلب جو پیتے ہیں روز ان نگاہوں سے
کیوں نگارِ صہبا سے - رنج بے خودی مانگیں

اب کہاں وہ دیوانے - جو زراہِ دل بازی
دولتِ سکوں دے کر - دل کی بے کلی مانگیں

خُونِ دل سے دھویا ہے چاندنی کا پیراہن
کیوں نہ اِن اُجالوں سے - حق روشنی مانگیں

ہر چراغ پھیکا - ہر نگاہ میلی ہے
کس سے لَو لگائیں ہم - کس سے روشنی مانگیں

جن کی بات سُنتے ہی - اعتبار آجائے
ثاقب آشناؤں سے ایسے اجنبی مانگیں

عبدالسلام اختر ایم۔اے
پرنسپل گھٹیالیاں کالج۔

خاص المغار کے لئے

تلاطم کے بھونکے۔ قضا کے بگولے
الٰہی یہ کشتی۔ نہ ڈولے۔ نہ ڈولے
وہ دُر اپنی رحمت کا جب آپ کھولے
تو پھر اَور رشتے کوئی کیوں ٹٹولے؟
ہُوا ہے پھر اِک چشمۂ پاک جاری
کوئی آ کے زمزم میں مُنہ اپنا دھولے!
یہ باطل کے حملے۔ یہ حملے کہاں ہیں؟
جلے دل سے اُٹھتے رہے ہیں پھپھولے!
زر و لعل و جوہر یہاں ہم نے پھینکے
معارف کے موتی یہاں ہم نے رولے!
یہی ہے حقیقت میں ذوقِ تکلّم،
کوئی پہلے تولے۔ تو پھر کوئی بولے!
محبّت بھی، کن کن منازل سے گزری
وہ رُوٹھے رہے اور ہم بھی نہ بولے!

نئی پَود کے دیکھ افراد اختر
نگاہوں کے دھوکے۔ کجی کے کھٹولے!

نظر امروہی

نفس نفس ہے مرا برقِ بے اماں کی طرح
کہیں قفس بھی نہ جل جائے آشیاں کی طرح

وہ دَیر ہو کہ حرم، ذوقِ بندگی کے لئے
ہر آستاں ہے ترے سنگِ آستاں کی طرح

یہ زندگی تو بہر رنگ، زندگی ہے مگر
کہیں بہار کی صورت کہیں خزاں کی طرح

کوئی مقام، نہ منزل، نہ جستجو، نہ طلب
ہم اُن کی راہ میں ہیں گردِ کارواں کی طرح

وہ بے خودی ہے کہ ان کے کرم کا افسانہ
سُنا رہے ہیں ہمیں اپنی داستاں کی طرح

یہ زندگی کی نظر اُلجھنیں نہیں جاتیں
ہزار بار ملے ہیں وہ مہرباں کی طرح

سینا ہے کہیں اور کہیں کرب و بلا ہے

ہر بار تیرے وصل کا انداز جُدا ہے

سرگرمِ عنایت تیرے دامن کی ہوا ہے

دل ہے کہ رہِ شوق کا بُجھتا سا دِیا ہے

یہ رنج و اَلَم، گریۂ شب، آہِ سحر خیز

جو کچھ بھی ہے سب تیرے تغافل کی عطا ہے

چھیڑا ہے بیاں میں نے جو بربادیٔ دل کا

نالوں سے مرے عرش پہ اِک حشر بپا ہے

شاید کوئی خامی تھی مری طرزِ وفا میں

واللہ مجھے ان سے نہیں خود سے گِلا ہے

بستا ہے یہاں کتنے حسینوں کا تصوّر

ویرانۂ دل مِصر کا بازار بنا ہے

ارشد ہے غمِ جاں ہے غمِ جانِ جہاں ہے

اِک بندۂ ناچیز پہ طوفانِ بلا ہے

بشارت احمد جمیل

○

ملتے ہیں بھلا میخوار کہاں اس دہر کے عُریاں خانوں میں
ساقی کی نظر وہ کیا سمجھیں جو کھو جائیں پیمانوں میں
کچھ عشق سے حاصل ہو نہ سکا بیکار پھرے ویرانوں میں
اپنوں کو یونہی بدنام کیا رسوا بھی ہوئے بیگانوں میں
جانے کیوں وعظ اس واعظ کا سینوں کو برماجاتا ہے
مقبول ہے یہ فرزانوں میں مشہور ہے یہ دیوانوں میں
جو بات زباں سے نکلی تھی وہ راز بنی افسانہ ہوئی
جو راز تمہارے حُسن کا تھا ملتا ہے میرے افسانوں میں
تو تشنہ لبوں کی پیاس بجھا عرفان کی مے کر ان کو عطا
دے جام پہ جام اور خم پہ خم اور ناپ نہ اب پیمانوں میں
ہے نور کی کوشش بے معنی اور سوز کی خواہش لاحاصل
"وہ نور نہیں ہے شمعوں میں وہ سوز نہیں پروانوں میں"
آنکھوں کی تسلّی ہو نہ سکی، ہیں بُت بھی حزیں بُتخانوں میں
ہے راحت کا فقدان جمیل اس دنیا کے سامانوں میں

عابد ربّانی

پیار کے دیپ بُجھ بُجھ کے جلتے رہے
اشک نوکِ مژہ پر مچلتے رہے

سسکیاں نہ رُکیں، ہچکیاں نہ تھمیں
لاکھ اشکوں کے طوفاں اُبلتے رہے

پیار کی آگ تھی اِس طرح شعلہ زن
صبر کے بھاری پتّھر پگھلتے رہے

نیند آئی نہ مجھ کو بھی اُن کے بغیر
رات بھر وہ بھی پہلو بدلتے رہے

عشق کی راہ میں میرے زخمی قدم
ڈگمگاتے رہے اور سنبھلتے رہے

آج اس راہگذر پہ ہوں تنہا جہاں
ساتھ میرے وہ شرما کے چلتے رہے

ایسی پُرسوز عابد نے چھیڑی غزل
عمر بھر رُوح کے ساز جلتے رہے

سمیع اللہ صادق

زندگی اب ہے تمہارے حُسن کے دیدار میں
مَیں دوانہ ہو گیا آکر ترے دربار میں

اب نہ دنیا سے تعلق ہے نہ تم سے واسطہ
دونوں عالم مل گئے ہیں مجھ کو بزمِ یار میں

مَیں غموں کی دُھوپ سے اُکتا گیا ہوں اسقدر
آن بیٹھا ہوں مَیں تھک کر سایۂ دیوار میں

بزمِ مے کو چھوڑ کر اور رزم سے مُنہ موڑ کر
دل کا ہدیہ لے کے آیا ہوں تری سرکار میں

ہے تجھے تیری قسم اب یوں نہ اپنا رُخ چُھپا
گھُٹ کے مر جاؤں گا ورنہ عشق کے آزار میں

"اے مرے پیارے مرے محسن مرے پروردگار"
پھونک دے روح القدس کو دار میں گفتار میں

لے نہ میرا امتحاں تجھ کو ہے تیرا واسطہ،
مجھ کو کر شامل تُو اپنے زمرۂ ابرار میں

یہ دُعا صادق کی ہے گر تُو کرے اِسکو قبول
خاتمہ اس کا ہو آخر کُوچۂ دلدار میں

عبدالحمید عابد

زندگی تجھ پہ لُٹا دی مَیں نے
یوں تری بات بنا دی مَیں نے

کب مجھے یاد نہ تیری آئی،
کب تری یاد بُھلا دی مَیں نے

قصّۂ شوق نہ تھا اتنا طویل
مُفت میں بات بڑھا دی مَیں نے

جب کوئی مجھ پہ مصیبت ٹوٹی،
اپنی قسمت کو دُعا دی مَیں نے

اب بھی یہ مجھ سے شکایت کیوں ہے
چھوڑ دی جب تیری وادی مَیں نے

کُوچۂ یار سے جب بھی گزرا
اِک فقیرانہ صدا دی مَیں نے

اب نظر میں تیرا نقشہ ہے نہ پیار
تیری ہر بات بُھلا دی مَیں نے

مجھ کو مطلوب رہا سب کا بھلا
دوست دشمن کو دعا دی مَیں نے

کوئی آیا نہ شبِ غم عابد
لاکھ یاروں کو صدا دی مَیں نے

جاوید منگلوری

مِٹ چکے تیری یاد کے سائے
کِس لئے آج تم چلے آئے

عشق کرنا ذلیل ہونا ہے
کاش اس کو بھی کوئی سمجھائے

دو گھڑی اپنے پاس آ بیٹھو
دلِ مضطر کو کچھ قرار آئے

حرفِ مطلب کبھی ادا نہ ہوا
تم بھی شرمائے ہم بھی شرمائے

چھا رہے ہیں فراق کے بادل
کاش ایسے میں کوئی آ جائے

کیا عجب ہے کہ تیرے آنے سے
باغ میں پھر بہار آ جائے

لَے میں حدّت نہ سوز سینے میں
آج محفل کو کون گرمائے

تیرا دل بھی عجیب ہے جاوید
جس کو دیکھے اسی پہ آ جائے

قمر کاشمیری

مَیں یہ سمجھا تھا اجل نے ہے بُلایا مجھ کو
تھا مگر تُو نے نیا جام پلایا مجھ کو

مِرے مرنے پہ چلے آئے وہ لیکن افسوس
مجھ سے کیا خاک وُہ ملتے جو نہ پایا مجھ کو

ایسا بے زار ہوں مَیں بزمِ جہاں سے اے مرگ
مَیں چلا آؤں گا جب تُو نے بُلایا مجھ کو

وعدۂ دید پہ مَیں یونہی چلا آیا تھا
تُو نے اے دوست نہ بھولے سے بُلایا مجھ کو

کوئی زندان تھا یا بزم تھی تیری ساقی
تو ہی بولا نہ کسی نے ہی بُلایا مجھ کو

شکوہ کس مُنہ سے کروں حال کہوں کس سے قمرؔ
تیری ہی آگ نے جب بڑھ کے جلایا مجھ کو

مجیب اللہ خان کشور

رُخ پہ پژمردگی سی چھائی ہے
دل نے پھر ایک چوٹ کھائی ہے

رُوح تھرّائی، جسم کانپ اُٹھا
بات جب بھی زباں پہ آئی ہے

پیار کے وعدے سب بُھلا ڈالے
بے وفائی سی بے وفائی ہے

چھیڑ مت دل کا راگ اے کشور!
دشت میں کب بہار آئی ہے

فضيلة العربية

(لحضرة سيدنا الميرزا غلام احمد القاديانی علیه الصلواة والسلام)

ثم انتم تعلمون ان فضيلة العلماء باللسان العربية ـ و هی المفتاح لفتح اسرار العلوم الدينية و هی مدار فهم المعارف الفرقانية ـ والذی ليس من نحارير الادباء و لا كمثل نوابغ الشعراء فلا يمكن ان يكون من فحول الفقهاء والراسخين فی الشريعة الغراء اومن العارفين الفقراء بل هو كالانعام و احد من العوام والجاهلين ـ

و اما الرجل الذی يقدر علی كلام غض طری فی هذه اللهجة و يسلك عند نطقه مسالك الفصاحة والبلاغة و يعلم فروق المفردات و خواص التاليفات و كوائف الجمل المركبة فهو الذی جعله الله رحيب الباع خصيب الرباع فی هذه الخزائن العلمية ـ و من ادعی انه من الواصلين والفقراء العرفاء و ليس من عار فی هذه اللسان كالادباء ـ ففقره ليس فقر سيد الكونين بل هو سواد الوجه فی الدارين ـ و لا تعجب بهذا البيان و لا تغضب قبل العرفان فان الذی يدعی محبة الفرقان كيف يصدء ذهنه فی هذه اللسان و كيف تقاصر مع دعاوی المحبة و شوق الجنان و كيف يمكن ان لا يتجلی لقلبه لطف الرحمن و لا يعلمه الله لسان نبيه بالامتنان ـ

ثم انها معيار لحب الرسول والفرقان فان الذی احب العربية فبحب الرسول والفرقان احبها ـ و من ابغضها فببغض الرسول والفرقان ابغضها ـ فان المحبين يعرفون بالعلامات و ادنی درجة الحب ن تحثك للمضاهات حتی توثر طرق المحبوب وتجعلها من المحبوبات و من لم يعرف هذا الذوق فانه من الكافرين فی مشرب العاشقين و من احب الفرقان و سيدنا خاتم الانبياء كما هو شرط المحبة والوفاء فما اظن ان يبقی فی العربية كا لجهلاء بل يقوده حبه الی اعلی مراتب الكمال و يسبق كل سابق فی المقال و يصير نطقه كالدرة البيضاء و يضمخ كلامه بطيب عجيب و يودع انواع الصفاء ففكر كالمحبين و لو لا الحب لما اعطيتها فمن الحب لقيتها فهذا آية حبی من ارحم الرحمين والحمد لله علی ما اعطی و هو خير المنعمين ـ

(انجام آتهم ص ٢٦٥-٢٦٦)

في مدح النبي الامي (صلى الله عليه وسلم)

(لحضرة سيدنا الميرزا غلام احمد القادياني الموسس الجماعة الاحمدية)

يا عين فيض الله و العرفان — يسعى اليك الخلق كالظمآن
يا بحر فضل المنعم المنان — تهوى اليك الزمر بالكيزان
يا شمس ملك الحسن و الاحسان — نورت وجه البر و العمران
قوم رأوك و امة قد اخبرت — من ذالك البدر الذى اصبانی
يبكون من ذكر الجمال صبابة — و تألماً من لوعة الهجران
و ارى القلوب لدى الحناجر كربة — و ارى الغروب تسيلها العينان
يامن غدا فى نوره و ضيائه — كا النيرين و نور الملوان
انى ارى فى وجهك المتهلل — شاناً يفوق شمائل الانسان
و قد اقتفاك اولو النهى و بصدقهم — و دعوا تذكر معهد الاوطان
جاؤوك منهوبين كالعريان — فسترتهم بملاحف الايمان
صادفتهم قوماً كروث ذلة — فجعلتهم كسبيكة العقيان
حتى انثنى بر كمثل حديقة — عذب الموارد مثمر الاغصان
كم شارب بالرشف دنا طافحا — فجعلته فى الدين كالنشوان
كم محدث مستنطق العيدان — قد صار منك محدث الرحمن
كم مستهام للرشوف تعشقاً — فجذبتهم جذباً الى الفرقان
احييت اموات القرون بجلوة — ماذا يماثلك بهذا الشان
لا شك ان محمداً خير الورى — ريق الكرام و نخبة الاعيان
تمت عليه صفات كل مزية — ختمت به نعماء كل زمان
يا رب صل على نبيك دائماً — فى هذه الدنيا و بعث ثانی
جسمى يطير اليك من شوق علا — يا ليت كانت قوة الطيران

لئيقه فرحت
ايم اے (عربى) الدرجة النهائية

حسان بن ثابت رض

و لد حسان فى يثرب و كان من بنى النجار من قبيلة الخزرج شعب من الازد - حدث النسابون ان الازد من بنى قحطان - كان حسان انصاريا بحيث لما اسلمت الاوس و الخزرج و نصروا رسول الله صلى الله عليه وسلم لقبوا بلقب الانصار - و كنية حسان ابوالوليد و ابو عبدالرحمن و ابو الحسام - و كان اسم امه الفريعة - عاش مائة و عشرين سنة ستون منها فى الجاهلية و ستون فى الاسلام - فى الجاهلية كان يمدح آل جفنة ملوك الشام لانهم متصلون بحبل القرابة باهالى يثرب - و كان حسان يقيم عاماً بالمدينة و العام الاخر فى آل جفنة و يمدحهم فكانوا يجدون عليه و يعطونه جوائز كثيرة و يكرمونه لانه كان شاعرهم - من اجود شعره ما قال فى مدحهم .

يغشون حتى ما تهر كلابهم
لا يسئالون عن السواد المقبل

و ابقى آل جفنة برهم على حسان و ما تركوا الجود و الافضال بعد اسلامه - لما ذهب جبلة بن الايهم ، احد ملوك آل جفنة ، الى هرقل ملك الروم بعد ارتداده عن الاسلام وصل اليه جثامة بن مساحق الكنانى و انشد له شعر حسان .

لمن الدار اقفرت بمعان
بين شاطئ اليرموك فالصمان

لما سمع هذا الشعر اعطاه جبلة مائة دينار و خمسة اثواب من الديباج لحسان - و ارسل اليه السلام .

كان حسان جبانا - نشاء فى زمن الجاهلية و شاهد كثيرا من حروب الاوس و الخزرج فى الجاهلية و شاهد الحروب فى الاسلام ايضا و لكنه لم يشارك

فی حرب واحد ـ و لم یقبض علی سیف او سلاح قط ـ انما کان لسانه سیفه و به و فی رسول الله صلی الله علیه وسلم ـ من هفوات اعداءه ـ کان حسان شاعر سیدنا رسول الله صلی الله علیه وسلم لما اشتد هجو القریش علی رسول الله الکریم قال لاصحابه ”ما یمنع القوم الذین نصروا رسول الله بسلاحهم أن ینصروه بألسنتهم ،، فقال حسان ”أنا لها ،، فقال صلوة الله علیه و سلامه ”ایدك الله بروح القدس ،، کان حسان اول الشعراء الذین قاموا لدفاع الاسلام بشعرهم و افحم کل معاند ـ یقول فی اشعاره :

فنحکم بالقوافی من هجانا
و نضرب حین تختلط الدماء

و هب له رسول الله صلی الله علیه وسلم سیرین القبطیة اخت مارية القبطية .

توفی حسان فی عهد خلافة الامیر المعاویة سنة . ٥ للهجرة .

شعر حسان

نجد فی شعر حسان الذی قال فی الجاهلیة غرابة الالفاظ و التراکیب وعمق المعانی و یستعمل الالفاظ المهجورة فی شعره .

لما اسلم و فهم القرآن العربی المبین و شرح الله صدره للاسلام فلان شعره بتاثیر اسلوب القرآن الکریم و حصل سلاسة الشعر منه ـ لکنه لم یبق من المعانی الدقیقة و الاغراض العمیقة .

قیل لحسان ”لان شعرك فی الاسلام ؟،، فاجاب ان الاسلام یمنع عن الکذب و ان الشعر یزینه الکذب ـ قال الاصمعی مرة : الشعر یقوی فی الشر فاذا دخل فی الخیر ضعف و لان و هذا حسان فحل من فحول شعراء الجاهلیة فلما جاء الاسلام سقط شعره .

اتفقت العرب ان حسان اشعر اهل المدر و هذه آراء ائمة اللغة فیه :

قال الاصمعی ـ ”حسان احد فحول الشعراء ،،

قال ابوعبیده ـ ”فضل حسان الشعراء بثلاث کان شاعر الانصار فی الجاهلیة و شاعر النبی صلی الله علیه وسلم فی النبوة و شاعر الیمن کلها فی الاسلام ،،

قال عمرو بن العلاء ـ ”حسان اشعر اهل الحضر ،،

قال حسان شعراً فی کل اغراض الشعر فقد مدح و هجا و افتخر و شبب (کان یشبب بامرأة اسمها شعثاء) و رثی و وصف .

کان اسلوبه اسلوب فحول الشعراء الجاهلین و المخضرمین و لما قال هذا الشعر فی مدح آل جفنة انتشر صیته فی کل نواحی العرب قال الحطیئة ـ ابلغو الانصار ان شاعرهم اشعر العرب حیث یقول :

یغشون حتی ما تهر کلابهم
لا یسئالون عن السواد المقبل

یقول فی مدح رسول الله صلی الله علیه وسلم :

نبی اتانا بعد یاس و فترة — من الرسل و الاوثان فی الارض تعبد
فامسی سراجا مستنیرا و هادیا — یلوح کما لاح الصقیل المهند
و انذرنا ناراً و بشر جنة — و علمنا الاسلام فالله نحمد

و قال یرثیه ایضاً

و جهی یقیك الترب لهفی لیتنی
غیبت قبلك فی بقیع الغرقد
فظلت بعد وفاته متبلداً
متلددا یالیتنی لم اولد
أقیم بعدك بالمدینة بینهم
یالیتنی صبحت سم الاسود

عطاء المجيب راشد
ايم-اے(عربی) الدرجة النهائية

فضائل العلم و وسائل حصوله

الحمدلله الذی خلق الجن و الانسان و علمَ الانسان مالم يعلم و علمه البيان - ان العالم الذی نسكن فيه و نقضی اجلنا الذی اجل الله لنا محتوية على معارف و سرائر شتی - هذا العالم يضمن على شعب لا تحصی بل فوق ذالك كل شعبة منها تشتمل على اجزاء متفرقة متنوعة و عديدة مع تفاصيلها الدقيقة و المفصلة - و على الانسان الذی جعله الله خليفته فی الارض و رفعه الی مقام اشرف المخلوقات ان يعلم المعارف الالهيئة و السرائر الروحانية مهما امكن له و يكشف عن غوامض التخليقات و دفائن الطبيعات الی حد استطاعته ليعرف وجود ربه معرفة تامة و يكون بعد ذالك عبداً لله كما هو قوله تعالی :

الذين يذكرون الله قيماً و قعوداً و على جنوبهم و يتفكرون
فی خلق السموات و الارض - ربنا ما خلقت هذا باطلا -
سبحنك فقنا عذاب النار (آل عمران ۱۹۲)

و الامر الثانی ان العلوم كلها تدور حول وجود الخالق و مصنوعاته اصلاً و لكن الناس قد قسموا العلم فی قسم عديدة على قدرعقولهم و حاجاتهم - و لكن كل واحد من العلوم دليل على وجود خالقه تبارك و تعالی و الی الله ترجع الامور - و الانسان الذی يحصل العلم بخلوص النية و يتفكر فی ما تعلم و يتدبر فی تفاصيل العلوم فهو يجد الله عياناً حاضراً - و يزيد ايمانه على وجود الله مع ازدياده فی العلم و هو ايضا يزداد فی خشوعه و تضرعه و انابته الی الله حين يطلع على دقائق العلوم و عمق المعارف - و هذه الحقيقة التی ذكرها الله فی القرآن الحكيم :

انما يخشی الله من عباده العلماء (فاطر ۲۹)

فالعلوم كلها علم واحد فی الاصل بحيث كلها تصدر و تخرج من مصدر واحد - و اريد

ان اذكر العلم مطلقا فى هذه المقالة ـ

ان العلم و المعرفة و الحكمة هى سبب فضيلة الانسان و شرفه على اصحابه اجمعين ـ ان العلم هو مفتاح قوى الانسان النائمة و الكمالات البشرية الخفية ـ ان العالم يعلم المفسد من المصلح و الخير من الشر و الحسن من القبيح ـ لان العلم يكون سراجه يستنيربه حينما يسلك فى طريق الحياة المظلم و يكون العلم بصيرته يستشيربه كلما المت عليه داهية الدواهى او وقع فى مصيبة هالكة لا خروج منها ـ و يكون العلم يد النصرة التى يستنصرها على نوائب الدهر و صروف الزمن ـ و لا جل ذالك يامن من العثرات و الزلات و يمشى مطمئناً هادئاً الى وصول قصده العالى و يفوز فيه بلا نقص و خسران و يبلغ الى حاجاته و مراميه بلا خيبة و خسارة ـ

ثم العلم يزين قلب العالم و دماغه فهو يجيد فى كل شيئ اختار و فى كل امر عزم ـ و العلم يجلى مداركه جلياً تاماً و يصقلها الى غاية الامكان ـ فاذا استحصل مهارة تامة فى العلم فهو يكون فى موضع لايقول الاصائباً و لا يرمى الاصادفاً ولايقصد الا فائزاً و يكون ذالك لاجل علمه و معرفته فى علوم الدنيا و ما فيها .

ثم العلم يمكن للعالم ان يعمل اعمالا تشيع صيته فى انحاء البلاد و اقاصى الارض و تبقى اسمه مذكوراً على وجه الارض و ذكره جارياً فى مجالس العلماء بعد وفاته ايضاً ـ قد ذكر الامر ابو محمد عبدالله بن محمد البطليموسى فى اشعاره الآتيه .

اخو العلم حي خالد بعد موته
واوصاله تحت التراب رميم
وذوالجهل ميت وهو ماش على الثرى
يظن من الاحياء وهو عديم

ثم العلم يعطى الانسان قوة جديدة و عزماً مقتحماً فهو يبدأ بالامور المهمة و المشروع الصعب و تبلغ يده الى الامور التى تقصر عن نيلها يد الجهلاء ـ وتكون هذه الهمة نتيجة علم واعتماده على قواه الذى يجد فى نفسه من اجل ذلك العلم والمعرفة ـ والعالم لا يبقى عابثاً او حائراً بل يعزم على امر ويتعاقبه بكل همة و نشاط مستمداً بعلمه و حكمته ولايزال هكذا حتى يبلغ غايته الا ان يشاء الله ـ

والله تبارك و تعالى قد فضل العلماء على الناس درجات كما قال سبحانه فى التنزيل :

قل هل يستوى الذين يعلمون و الذين لا يعلمون (الزمر : ١٠)

هذه الآية الكريمة دليل ساطع و برهان قاطع على فضيلة العلماء و تظهر ايضا مرتبة العلماء و مناقبهم العليا - و قد جاء فى القرآن الحكيم فى موضع آخر :

يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين او توا العلم درجات (المجادلة : ١٢)

فالعلم علامة مميزة خاصة للعلماء و تكون اماراتها ظاهرة باهرة من اقوالهم و افعالهم و اعمالهم و اطوارهم و نستطيع ان نقول ان العلم هو تاج للعالم لا مثل تيجان الدنيا التى تفنى و تزول عظمتها ورونقها بعدا عوام قلائل بل هو تاج بازغ ذو بهجة و بهاء دائم لاينتقص شانه على مرورالايام ولاتنال منه شيئاً السنوات المتسلسلة من سلك الزمن -

قال بعض العلماء " ان العلم اشرف مارغب فيه الراغب و افضل ما طلب وجد فيه الطالب و انفع ما كسبه و اقتناه الكاسب لان شرفه يثمر على صاحبه و فضله ينمى على طالبه "

ان الله تعالى قد حرض المسلمين على تحصيل العلم لان العلم هو زينة الانسان فى الحيواة الدنيا و ما بعدها - قد ذكر الله فى القرآن قصة موسى عليه السلام اذا اراد ان يتعلم العلوم الروحانية و استأذن من معلمه لصحبته - قال موسى عليه‌السلام :

هل اتبعك على ان تعلمن‌مما علمت رشداً (الكهف : ٦٧)

و فى موضع آخر علم الله المسلمين دعاء بلسان النبى صلى الله عليه وسلم يامره :

وقل رب زدنى علماً (طه : ١١٥)

فبذكر اسوة الانبياء عليهم السلام حمل الله المومنين على تحصيل العلم فى كل لحظة من حياتهم و النبى صلى الله عليه وسلم ايضاً قد ذكر اهمية العلم و شرفه

و اوجب تحصيله على سائر المسلمين مدة حياتهم - قد امر النبى صلى الله عليه وسلم بتعلم العلوم و ان كانت العوائق الشديدة الهائلة حائلة بينها و بين طالبها - و انقل بعض احاديث النبى صلى الله عليه وسلم فى هذا الموضوع ههنا :

١- طلب العلم فريضة على كل مسلم و مسلمة -

٢- اطلبو العلم ولو بالصين -

٣- اطلبوا العلم من المهد الى اللحد -

٤- من خرج فى طلب العلم فهو فى سبيل الله حتى يرجع -

٥- ومن سلك طريقاً يبتغى فيه علماً سهل الله له طريقا الى الجنة و ان الملائكة لتضع اجنحتها لطالب العلم رضاً بما صنع - و ان العالم ليستغفر له من فى السموات ومن فى الارض حتى الحيتان فى الماء - و فضل العالم على العابد كفضل القمر على سائر الكواكب - و ان العلماء ورثة الانبيآء و ان الانبيآء لم يورثوا دينارا ولا درهماً انما ورثوا العلم فمن اخذه اخذ بحظ وافر -

تحصل العلم من ذرائع و وسائل شتى - و على طالب علم ان يتخذ كل ما يمكن له و منها اهمها و اشهرها الاستعانة بالله العلى العظيم ان الانسان ضعيف حقير ولا يستطيع على عمل او فكر بلا عون الله تعالى وهو محتاج الى نصرته دائماً - و اذ كان الله فى عون عبد فلا مانع له من الوصول الى مقاصده - فهذا امر ضرورى لطالب علم ان يدعو الله دائما ولا يزال يستنصره تعالى كلما اراد تحصيل العلم لان الله هو المستعان الحقيقى و القدير الرحيم -

ومنها اتخاذ الاسباب الضرورية و الاجتهاد الجارى - ان العلم كنز فاخر و متاع ثمين و مرتبة عالية و قد قدر الله المراتب العليا و المناقب السامية فى حظ الذين يشاقون على انفسهم فى سبيلها ولا يزالون يطلبونها ليلاً و نهاراً كما قال الشاعر:

بقدر الكد تكتسب المعالى

ومن طلب العلى سهر الليالى

ومنها رغبة شديدة فى حصول العلم - لابد لرجل يسلك طريق العلم ان

تكون له بغية واثقة متصلة بقلبه دائما فهو يتوجه الى مقصده الوحيد طول حياته - حصول العلم كمثل اقتحام العقبة ولا يمكن هذا دون الجهد الكامل و المشقة المتعبة - ومن اوجب هذه الرياضة على نفسه فرج الله له سبيلاً الى العلم لان الله يعين الذى يعين نفسه اولا -

ومنها السفر - كل العلوم لا توجد فى مكان واحد بل هى منتشرة فى جميع انحاء البلاد - فالسفر والرحلة وسيلة عظيمة مفيدة لحصول العلم و قد اشار النبى صلى الله عليه وسلم الى هذه الوسيلة فى قوله :

اطلبوا العلم ولو بالصين

ومنها السوأل - قال الله فى القرآن المجيد :

فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون (النحل : ٤٤)

وبالسوأل يعلم الانسان مالا يعلم و السوأل يرفع الابهام و الاشكال التى توسوس فى قلبه حين لايجد جواباً لها من نفسه - وليكن السوأل بعد تدبر و تحقيق كامل و بالنية الخالصة فقط و قد منع النبى صلى الله عليه وسلم من كثرة السوأل -

قد ذكرت بعض ذرائع حصول العلم و هى عديدة و منها بالاختصار : اكرام الاستاذ والوقت و الوسائل المفيدة و الهمة و النشاط - ولله در القائل :

اخى لا تنال العلم الا بستة
سانبيلك عن تفصيلها ببيان
ذكاء و حرص واجتهاد و بلغة
وصحبة استاذ و طول زمان

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

PUNJAB UNIVERSITY CHAMPIONS

(1963 - 64)

THE COLLEGE ROWING TEAM

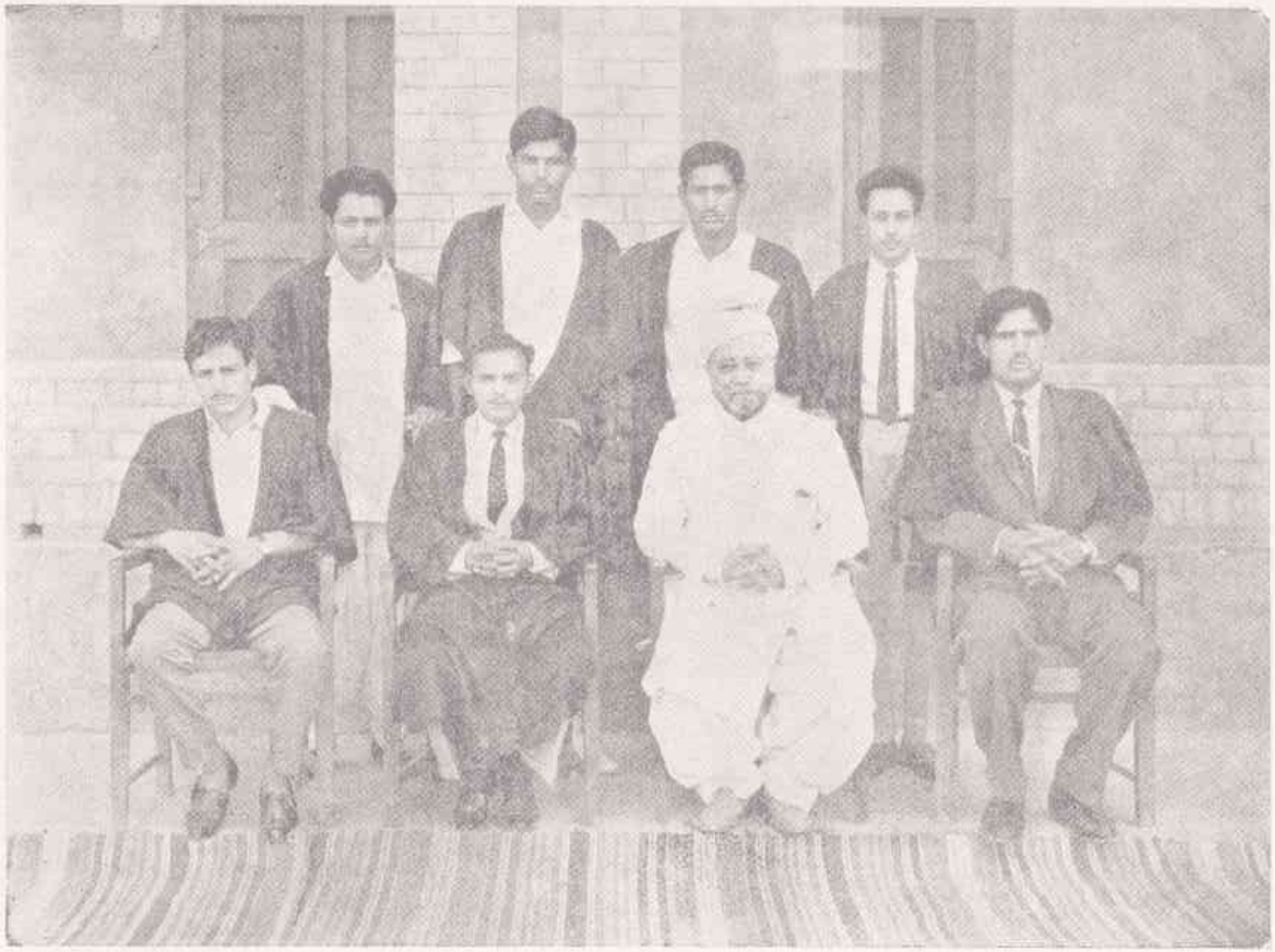

Chairs (L to R) : Mohammad Qasim Khan, (Secretary) ; Ch. Hamid Ahmad M. A. (President); Hazrat Sahibzada Mirza Nasir Ahmad ; Mohammad Yar Sipra (Captain) ; M.A. Oxon, (Principal)

Standing (L to R) : Hamid Ahmad Awan, Shahid Ahmad Chaudhry, Mohammad Khan, Syed Mohammad Ahmad.

AL-MANAR

JULY, AUGUST, SEPT.,

1964

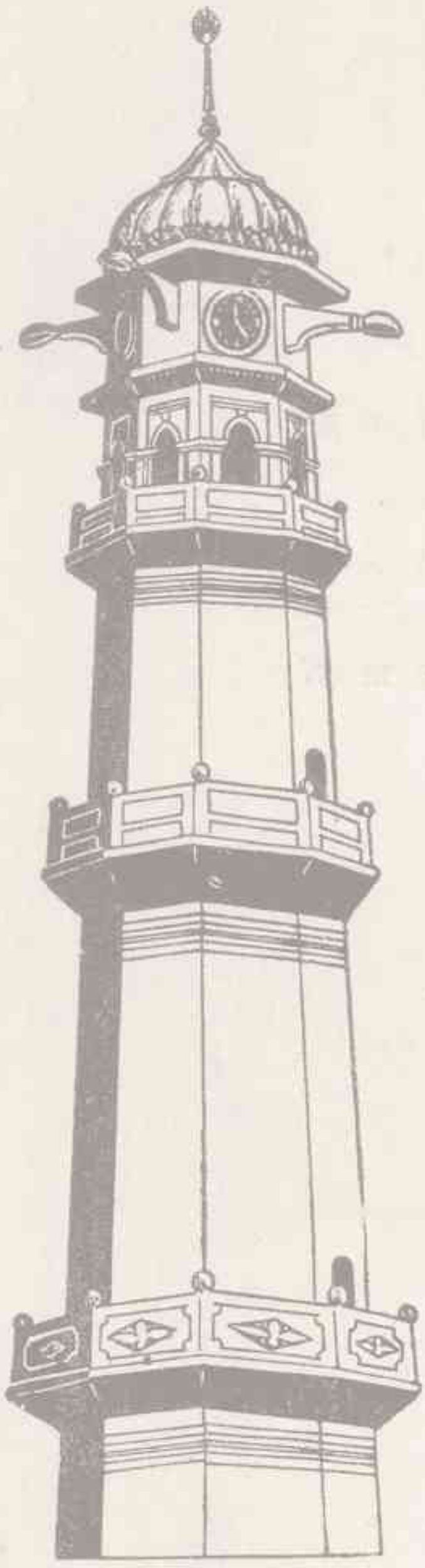

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

RABWAH

MAGAZINE

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College, Rabwah

July, August, Sept., 1964

Staff Editor

HAMID AHMAD CHAUDHRY M.A.

Editors

ATA - UL - MUJEEB RASHED

MIRZA MAGHFOOR AHMAD

Contents

1.	Editorial	...	1
2.	Allah Provides sustenance	...	3
3.	Sacrifice in ture sense *The Promised Messiah*	...	5
4.	Religion and Society *Maqbool Malik*	...	7
5.	A Social Insect *A. Shakoor Aslam M.Sc.*	...	12
6.	Education in U.S.S.R. *Muhammad Arshad M.Sc.*	...	22
7.	Parasitim in Animals	...	32
8.	Nuclear Reactors	...	38
9.	Uhuru	...	41
10.	فضيلة العربية	...	١
11.	فى صلاح النبى الامى صلعم	...	٢
12.	حسان بن ثابت رض لئية فرحت ايم اے (عربى) الدرجة نهاية	...	٣
13.	فضائل العلم و وسائل حصوله عطاء المجيب راشد ايم اے (عربى) الدرجة نهاية	...	٦

Printed at the Nusrat Art Press, and Published by A.R. Junaid Hashmi
for Talim-ul-Islam College, Rabwah.

AL-MANAR

Talim-ul-Islam College, Rabwah

MAGAZINE

Vol. XIII	July, August, September, 1964	No. 3

EDITORIAL

The college completes its twenty years today. Our hearts are full of gratitude and we bow down in all humbleness and humility to Allah the Most Gracious and Merciful, for without His kind help we would not have been able to achieve our objectives so successfully. Sice 1944, the year of its opening, the College has faced multifarious difficulties and bottlenecks. Only three years after its inauguration, we had to leave the grand building, the Library and the Science Laboratories which had been built and equipped at a huge cost. After partition, the College shifted to Lahore, where a dilapidated building of D. A. V. College was alloted to it. The Managing Body spent about a Lac of rupees on its repairs and furnishing to make it fit for an educational institution. During its seven years stay at Lahore, the College gained a reputation for its unique atmosphere and discipline. It was considered as one of the best three local colleges. But its destination was Rabwah to where it was shifted in 1954, in its present building. Thus practically, during

the first ten years, the College authorities had to build and equip three buildings. Inspite of all this, we are not unhappy to look back on our past. We do not claim perfection, but we do take pride in claiming that during the brief span of two decades, which is too short a time in the life of an institution, we have strived, and not unsuccessfully, to fulfil the objectives laid down for it by its founder — *Hazrat Khalifatul Messiah II.* According to him the aim of opening this College was to produce young men who should not only have degrees and diplomas of the University but should also be well-versed in the fundamentals of Islam and be able to establish its superiority over other religions. For this purpose special attention has always been paid to teaching of the Holy Quran, Islamic History and tradition. All possible care is taken to save the students from imitating the vagaries of the Western culture. Efforts are made to make them live according to the dictates of Islam. A tight discipline is maintained to save them from forming such dirty habits as cinema-going and cigarette-smoking. Thus in addition to efforts towards academic progress, a close watch is kept on their activities outside the College. All this has helped to make our students morally and spiritually better than those of other colleges. At present hundreds of our graduates are serving the country in Civil and Military ranks. Many of our old boys are serving the cause of Islam as Missionaries in foreign countries. Others are serving the Community wherever their services are required.

But we are not satisfied with what we have achieved. We wish to develop and upgrade the college to post graduate level, even higher. M.A. in Arabic has already been started. Spade-work has been done to start M.Sc. in Physics and Chemistry. Post graduate Laboratories are nearing completion in the New Campus. All this promises a great future for the College. Let us pray to God that He may crown our humble efforts with success.

Allah Provide Sustenance

وما من دابة فى الارض الا على الله رزقها ويعلم مستقرها
و مستودعها كل فى كتب مبين

And there is no creature that moves in the earth but it is for Allah to provide it with sustenance. And He knows its lodging and its home. All this is recorded in a clear Book.

Commentary :

The verse declares that God has provided sustenance for all His creatures but it rests with them to make proper use of it. He has provided the means of subsistence for even the worms and reptiles that dwell in bowels of the earth. Human reason is at a loss to know how and whence the worms and insects found in such unlimited numbers on and inside the earth get their food. There are many insects about the nature of even whose food man is in the dark, but all are getting their sustenance from nature. An interesting instance of how God makes provision for animals is furnished by the crops which men sow. While wheat makes an article of food for man, its stalk, leaves and husks provide food for animals. If God had not produced these things along with the grains of wheat, most men might have neglected their own ulterior interest and starved the dumb cattle.

God has created nothing without purpose. Even prickly shrubs form food for the camel and the goat, while the worms that grow in the human body get their food in the body itself. In fact, every species of worm, insect and animal had its particular food provided for it in nature. Even beasts of prey, which live on different kinds of animal diet seldom go hungry. Man who presumes to have solved the mysteries of the universe is not yet fully acquainted with all forms of life, to say nothing of knowing the different kinds of food on which they subsist. But God has made ample provision for them all.

What the Quran points of in this verse is that when God has supplied the physical needs of the meanest of His creatures He could certainly not have neglected to make provision for the moral and spiritual needs of the noblest of His creatures—man, who is the acme of His creation. It is unthinkable that when man was a mere clot of blood in the womb of his mother God supplied all his needs, but when he grew up to perfection and stood in need of guidance for the cultivation of his moral and spiritual faculties, He left him to his fate. Most assuredly God has provided both physical and spiritual sustenance for man; but it is for man to get it and make a proper use of it.

The words, *He knows its lodging and its home,* refer not only to the temporary and the permanent abode of every living thing but also to the utmost limit to which its power can develop. The expression is thus intended to point out that only the Being Who knows the place where a thing lives and the utmost limits of its faculties can devise and provide the food best suited for it. To explain this point we may take the example of the body and the soul. We find that in teaching devise by human beings either only the needs of the permanent abode, which relates to the human soul, have been taken into cosideration, and the needs of the body, which serves as a shell for the soul and is thus man's temporary abode, have been neglected; or the betterment of the temporary abode *i.e.* the body, has received the whole attention and the requirements of the soul have been lost sight of. The truth is that with the help of his intellect alone it is not possible for man to provide for both his material and spiritual needs; for he does not know what will happen after death, and his spiritual needs concern primarily his life in the Hereafter. It is only God Who does so.

(*From Commentary on the Holy Quran by Sayyedina Hazrat Khalifatul Massih II*)

Sacrifice in true Sense

(By Hazrat Mirza Ghulam Ahmad, the Promised Messiah)

One of the great and noble moral qualities is thus described in the Holy Quran:

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین

"Say to them: 'My prayers, and my sacrifice, and my life and my death are solely for God': (VI: 163), i.e., for the manifestion of the Divine glory and for the welfare and benefit of mankind so that with his death a life might be granted to them. It should not be imagined that death in the way of God and for the good of mankind here spoken of means that the Prophet, peace and blessings of God be on him, was under the delusion, like ignorant and mad men, that a suicidal end of ownlife would, in any way, benefit others. Nay, the Holy Prophet, peace and blessings of God be on him, hated all such ideas and the Holy Quran regards the person who entertains such ideas as guilty of a serious crime and says in plain words:

و لاتلقوا با یدیکم الی التهلکة

"Do not commit suicide and make not your own hands the instruments of your destruction" (II: 195). It is a plain truth that one man cannot relieve another of headache by breaking his own head. Such a step is at the best an act of foolishness. In short, the reference to the prophet's death in the way of God and for the benefit of mankind simply denotes that the Holy Prophet, peace and blessings of God be on him, had devoted his life out of sympathy for the welfare of mankind, and with his prayers and preaching, and the adoption of every wise method

for the regeneration of his people, as well as by bearing patiently their persecutions, he had sacrificed his life and all his comforts in this path. With reference to this sacrifice of his life the Holy Quran elsewhere says:

لعلک باخع نفسک الایکونوا مومنین

And again.

فلاتذ هب نفسک علیهم حسرات

i.e., "Wilt thou wear thyself away with grief and hard work for these people who believe not" (XXVI : 3). "And wilt thou spend thy soul in sighs for these people who do not accept the truth" (XXXV : 8). The way in which a man may sacrifice his life for his people is, therefore, to encounter all difficulties and work hard for their welfare by adopting measures which are likely to better their condition.

(*From the Teachings of Islam.*)

Maqbool Malik

Religion & Society

The ancient history of mankind reveals the fact that human race was vulgar and barbarian before the introduction of religion to the world. Life was dull and monotonous on earth. Man lived completely naked in the huge and dark caves of mountains. The green leaves of trees and uncooked flesh of beasts were the food of man. Briefly, they were devoid of any culture and civilization.

History tells us that human mind, like the human body, has had to undergo a series of evolutionary changes. When his intellect reached up to a point when he could receive and understand God's revelation, God sent His revelation to the most perfect man of that time to establish and ensure a social order in the world. This was the first step taken by the Almighty God towards the formation of a human society. Certain social rules were chalked out relating to the welfare and prosperity of mankind.

What is a society? What are the fundamentals of a society? Why do we need a society? These are the basic questions which may cause interruption when one is seriously dealing with the subject.

Society is a fellowship, a companionship, or in a broader sense the civilized body of mankind. The fundamentals of society are to cultivate prosperity, happiness and peace in the world. It is worth noting that religion has a remarkable power to introduce a society based upon the marvellous and splendid laws of humanity.

God sent several prophets who claimed that they had a noble mission before them according to which everyone would enjoy an even handed justice. All these prophets came

to establish the reign of law as Jesus Christ said:

> "Think not that I am come to destroy the law, or the prophets, I am not come to destroy but to fulfil..."

The life of every prophet is subjected to a common cause, which is to enforce the divine law in the world and to bring the human beings under the shelter of the flag of one undisputable God. In other words he endeavours to introduce an international society in the world. His life becomes a great motive for this purpose. George Bernard Shaw, expresses his valuable ideas about Prophet Muhammad (peace and blessings of God be upon him) in these words.

> "I have studied him, the wonderful man and in my opinion, far from being an anti-Christ, he must be called the saviour of humanity. I believe if a man like him were to assume dictatorship of the modern world, he would succeed in solving the problems in a way that would bring in the much needed peace and happiness." *(On getting Married)*

These remarkable ideas of George Bernard Shaw, clearly indicate that religion and religious man are greatly interested in the formation of a well organised society, which is a source of happiness, justice and freedom. In religion every man is free to make a choice for himself.

Religion has introduced culture and civilization of a very high order. It has eradicated the very evils which were prevailing in the world. The Arabs who were vulgar, cruel and hostile in the pre-Islamic period, became civilized and sympathetic when they accepted Islam. Islam purified their thoughts and manners, and made them the most forward nation of their time.

The main purpose of religion is to lay down the basic principles on which man's relationship to his own self, to his fellow beings and society, and above all, to Almighty God are to be reared. Religion, and especially Islam, provides guidance in every field of life. It helps us to promote

education, industry, and scientific research which are the essential needs of the modern society. Religion provides us means to maintain internal security and defence against external aggression. Religion refines our thoughts and ideas, and makes them more fine and sublime. It awakens the moral consciousness of man, and uses this moral force for the reconstruction of society and his personal character.

Religion produces a sense of brotherhood among human beings. The holy prophet of Islam says :

> "No man's faith shall be perfect unless he whishes for his brother whatsoever he wishes for himself."

God says in Quran—the most perfect book in the religious world :

> "...And remember God's goodness towards you, how that when you were enemies He united your hearts, and through His grace, ye became brethern, and when ye were on brink of the pit of the fire, He drew you back from it, thus clearly God showeth His signs that ye may be guided".

This verse clearly speaks of the great benefit, which the world has derived as the valuable product of religion.

Religion establishes virtue and justice in the world, abolishes the inhuman customs. It takes effective measures for the suppression of slavery. It recognizes the rights of all nations, great or small, black or white, whatever they may be.

Religion produces a society which inculcates purity of heart, cleanliness of body and sobriety of mind.

Such a society inculcates love and not hate, forgiveness and not vengeance, mercy and not retaliation. It ensures good manners, hospitality, fairness in dealing, regard for the superior, kind treatment to inferiors, respect for women, and care for orphans and the weak.

Today those nations who cry down religion, are facing grave moral situation. They are falling into the deep abyss of degradation, and the only possible way to get out of it is

to abide by the laws of religion which is uncorrupted, pure and perfect in its philosophy of life. Professor Toynbee says :

> "Religion was indispensable for human beings, and without it the existence of man was not possible. Religion was essential for solving the most complicated problems of the individual and society. In modern scientific advancement religion has still to play a better and important role for the preservation of the personality of man."
> (*Quoted in the Islamic Review London January 1960, p. 30*)

This shows that even in this scientific age, religion is as indispensable as it was in the pre-scientific period. As a matter of fact, religion does not oppose science. Religion and science, both say that all natural and mechanical changes are expressions of one law. It would be interesting to know that those who first introduced the scientific knowledge to the world, were also religious men. So, we can say that science is a greatproduct of religion. So the modern scientific society is, indirectly, the product of religion.

Religion encourages us to find out the secrets of nature, and to utilize the products of great natural and mineral resources which are provided to us. Through science we have been able to see the great manifestation of God's creation. Scientific knowledge has broadened our outlook and life, and it has eradicated narrow mindedness, prejudice, and ignorance.

Communism which is an anti-religious movement, has tried to misrepresent religion before the people of the world in the current century.

The Communist people think that religion is the greatest hinderance in the material advancement of man. Lenin states in his book "Religion" that religion merely consoles the people with the hope of reward in heaven, and it has produced nothing except the worst form of brutality, moral corruption and fanaticism. This type of propaganda is quite baseless and far away from reality. As I have clearly described above, religion introduces a social philosophy to us, which stands for justice and truth. It constructs a society which tends

to promote the welfare and prosperity of mankind, in as much as it cultivates charity and goodwill to all people. Such a vast society regulates the relationship of man to God, and his dealings with the fellow-men in the social, political and economic spheres of life. Indeed, religion produces a remarkable society which enlightens the hearts of enslaved people with the hope of freedom, which is a source of inspiration for the weak and a torch-bearer for the ıree men of the world.

A. Shakoor Aslam M.Sc.

A SOCIAL INSECT

(Honey Bee—Apis mellifica)

There are about fifty thousand insects out of which six thousand are purely social. They live in society and each society consists of at least two parents and their offsprings. These two generations live to a varying extent, in mutual co-operation, in a common abode or shelter. One of the prominent forms of these social insects is the 'Honey Bee'.

The classification of Animal and plant kingdom is based upon evolutionary trends. The most primitive forms in the animal kingdom are considered to be the protozoan animals which are single-celled individuals performing all the vital functions of life within the same cell and the most advanced are the mammals which include man. These are multi-celled animals (Metazoan).

There are about ten Phyla or stages in the animal kingdom, Protozoa being in the first or the most primitive stage. The insects, including honey bee, are placed in 'insecta' of sixth stage or phylum named Arthropoda. It is surprising that the man of the tenth stage of most highly evolved group, and the insects of sixth stage, both show a close resemblance with each other so far as the tendency of social behaviour is concerned, and the biologists are unable to trace the evolutionary path of this particular tendency from insects to man. The nervous system in a typical insect, especially a social one, consists of rudimentary brain, various ganglia and thousands of nerves reaching each and every muscle of the body to respond to the external stimuli. It is surprising that members of advanced stages or phyla of the eighth and ninth orders as snails, slugs star fishes etc. have no such type of complicated nervous

system. The class 'Insecta' includes more than fifteen orders and fifty thousand species. Out of these order Isoptera and order Hymenoptera with six thousand species are truly social. Isoptera comprises termites and Hymenoptera consists of wasps, ants and bees. Bees are placed in family Bombidae with two hundred species.

A bee passes through different stages during its complete life history. The developing stages comprise the eggs, the larva, the nymph, and the adult or Imago. Larvae and nymhs are different in shape and mode of living from the adult bees. An egg develops into a larva, a larva into a nymph, and a nymph into a stage resembling a true bee called Imago.

The eggs give rise to three different types of bees.

1. The Queen
2. The Drone or Male bees.
3. Workers, which consitute the majority of the population of the hive and which are sexually impotent, collect honey and produce wax to build hive cells.

To study the complete life of a bee, let us go to a full fledged bee-hive.

The hive consists of one and only one queen and eighty to ninety thousand workers, male and larvae etc.

The workers possess a peculiar structure i.e. the mouth parts are well developed, labium and maxillae are specially modified for sucking nectar which is later on converted into honey. There are special glands on the ventral surface of the abdomen to prepare wax.

The queen may be distinguished from others by having

(i) a longer abdomen
(ii) no apparatus for sucking nectar from the flowers.
(iii) absence of wax glands
(iv) absence of pharyngeal salivary glands and
(v) comparatively shorter sting.

Although the queen has the above-mentioned disqualifications

yet it is the unique symbol of love and is the mother of the hive. It is regarded as the most sacred part of the bee community. The purest honey is distilled specially for her use alone. She has an escort of workers watching over her day and night. Should the least accident befall her, the bees would spread quickly from group to group and the whole population would rush to and fro in loud lamentations. If the queen is taken away from the hive, all the work will instantly cease and the whole population will dwindle and perish of distress even though every flower blooms before them. But if the queen is restored before the bees, work and order is restored at once and a sweet sacred song is started in the hive. It is worth mentioning that bees never permit more than one mature queen in the hive. If a second queen is introduced into the hive the bees will pierce the intruder with their venomous stings and she will die on the spot. Sometimes the bees surround the intruder and keep her in a prison, till she dies of suffocation or hunger. Occasionally the legitimate queen comes forward and starts a duel with the intruder. The bees form a circle and eagerly watch the duel. Victory often goes to the reigning queen due to the favouritism of the bees towards her. With such dignity the queen, along with others, leads her life.

At the beginning of spring due to an invincible power, the queen is forced to leave the hive. An order is issued and the time of departure is fixed. Workers remain busy and prepare for the journey. Every worker burdens himself with a provision of honey sufficient to last for five or six days. From this honey the workers distil the wax required for the immediate construction of a new hive. The chemical process by means of which this honey is converted into wax is still unknown. This wax after being made from honey is accumulated in various glands which are located between the abdominal segments on the ventral surface of the body. The signal for departure is given by the queen itself and with the order the bees rush out with an enormous speed and the

hive becomes almost empty within a few seconds. Out of ninety thousand bees about seventy thousand leave and twenty thousand remain within the hive. The bees who leave the hive are called swarmers. The queen selects a branch of a tree and all others surround the queen. They sit one upon the other except for a few scouts who run here and there in search of a suitable shelter. When the scouts return, a choice is made and in the morning the entire swarm disunites and steers its straight course over hedges and cornfields, over rivers, valleys and mountains to the determined goal.

Here in the selected dwelling nothing is to be found, not a single drop of honey, not a bit of wax, neither guiding mark nor point of support. Yet the greater portion of the swarm cling on one another and a sort of triangular inverted cone is formed. The bees remain thus suspended on one another for a period of about twenty hours.

The temperature becomes so high that one might almost believe that a fire was buring. Due to this high temperature the glands of the abdomens containing the wax are stimulated and secrete wax in the form of white transparent scales which remain attached to the abdomens.

Now one of the bees, as though suddenly inspired, abruptly detaches itself from the mass and climbs to the culmination of the cone and with her mouth and claws seizes one of the waxen scales that hang from her abdomen. It extends the waxen scale to a required dimension and attaches it to the support, thus laying the key stone of an inverted city hanging down from the sky. To this key-stone other waxen scales are added one by one till a small block of wax is prepared. Then another bee, which is different from the first and belongs to the sculptor class of workers, emerges from the mass and carves like an experienced engineer, the first cell with the wax. Other sculptor bees join in and various cells are formed from the wax. The types of cells carved are of three kinds.

(i) Royal cells having the shape of an oak fruit for

the Royal Family.

(ii) Larger cells for the rearing of males and store of provisions.

(iii) Small cells for the workers.

It is worth mentioning that the dimensions of the cells are so accurate that at the time when metric system was not established and a standard for measurement was required, Reaumur proposed to select for this purpose the cell of the bee hive. On the whole the hive is so skillfully built that free circulation of air is ensured and congestion of traffic is prevented.

When the first row of dwelling cells is completed, the queen takes possession of her escort. It is to be added that the workers always avoid turning their back towards the queen. When she approaches a group of workers, they arrange themselves so as to face her and do not turn their backs towards her. They even walk backward before her in honour of her royal dignity. When the hive is completed, then the queen reaches a cell and deposits an egg in it and proceeds to the next cell. She does not cease laying the eggs till she traverses the whole circumference of the hive and returns to the first cell again. By this time most of the cells are emptied due to the development of bees from the eggs.

The eggs which the queen lays in the royal cells later give rise to members of the royal family. But these eggs are hatched into the royal bees only when the queen has left the hive with the swarm again.

The eggs laid in large cells will produce male or Drones and the eggs in the smaller cells will develop into workers only.

Is'nt it surprising that the queen lays different types of eggs in the cells of different dimensions. It shows that she possesses the sixth sense of determining the nature and size of the egg within her, while the man, inspite of all his attempts, has failed to know the nature of sex while a child is present in the womb of a mother.

Distribution of Work :

A newly hatched worker bee during the first two days

prepares cells for the reception of future eggs. At the age of third to fifteenth day, she feeds the other larvae by honey brought into the hive by older bees. At the age of sixteenth to twentyfifth day she visits the flowers which are pointed out by older workers and brings the honey to the hive and at the age from twentysixth day to death she remains in the field and points out the flower fields of honey to the young bees. Now suppose one bee brings a special type of honey trom a particular flower. She points this thing out to others and the result is that the other bees also start visiting the same type of flowers.

A famous biologist Von Frinch by various experiments showed that one bee can easily communicate with the other bee and it is generally done by dancing and other movements.

Suppose a bee finds a source of food somewhere, she comes to the hive, leaves the hive and starts dancing. Observing this scene the other bees come to know that a good source of honey has been found. Consequently others follow her course.

Even the distance of the source of honey from hive can be communicated and it depends upon the type of dance performed by the bee. The dance may be of two types, viz : circling dance and wavy dance. If the source of food falls within a distance of fifty to hundred meters from the hive, the bee will make circling dance. If it is hundred to two hundred meters, she will perform wavy movements. The exact distance from the hive can also be ascertained. Suppose the distance from the hive to the source is two hundred meters, she will make smaller turns in her waving movements as for example ten turns in ten seconds but if the distance is increased the turns will become longer ; for example in a distance of three thousand meters it will make only three turns in ten seconds. Thus the number of turns varies with the distance. If the distance is smaller the number of turns is greater and if the distance is greater the total number of turns will be lesser.

If a bee comes from a feeding place and itself does not want to go again to the feeding place, then she points out the direction and distance of the source to other workers in the hive. For

this purpose she will use the direction of the sun. Suppose the sun is just above the feeding place as seen from the hive, the bee will turn its head upward and if the feeding place is opposite the sun, it turns its mouth downwards. It is more surprising that she can indicate the direction as well as the distance even if the sun is hidden under clouds or the hive is hidden under crowded trees. How she communicates is not known, perhaps some special rays from the sun probe into the eyes which give a sensation to the bee about the direction.

Question arises as to how the nectar of the flower is converted into honey. The nectar and pollen present in the flowers are sucked by the bee. It passes from the mouth to the pharynx, then to a storage chamber called the crop. In the storage chamber various enzymes derived from the salivary glands react with it which convert the sugar of the nectar into dextrose and Levulose and other types of sugars which is now called 'Honey'. The exact process and the nature of the enzymes is not known. Scientists have tried to convert nectar and the pollen of the flowers into honey by certain chemical processes but have failed in their attempt. Undoubtedly this manufacturing process is done in the machinery present in the body of the bee in accordance with the word of Allah:

و اوحى ربك الى النحل ان اتخذى من الجبال بيوتا ومن الشجر
و مما يعرشون . ثم كلى من كل الثمرات فاسلكى سبل ربك ذللا
يخرج من بطونها شراب مختلف الوانه فيه شفاء للناس ان فى
ذالك لاية لقوم يتفكرون .

(نحل ٦٩ - ٧٠)

i. e. "And Thy Lord has inspired the bee, saying 'Make thou houses in the hills and in the trees and in the trellises which they build. Then eat of every kind of fruit, and follow the ways of thy Lord that have been made easy for thee'. There comes forth from their bellies a drink of various hues. Therein is cure for men, in that is a sign for a people who reflect".

Now let us see what has happened to those twenty thousand bees or larvae which had not acccompanied the qeen but had remained within the old hive. The old hive consisted of almost twenty thousand population comprising eggs, larvae, nymphs and a few workers. When an egg is hatched out into a larva a special nutrient material called Royal Jelly is provided by the workers for their nourishment. The larva which will later develop into queen is fed by this royal jelly throughout its life, while the male and worker larvae receive a different and ordinary diet from the fourth day onward. The royal jelly is a specialised honey which differ's from ordinary honey. The diet of the qeen, workers and Drones has been tested chemically and the following is the ratio of the food constituents provided to different individuals:

Individuals	Percentage of Protein	Percentage of Fats	Percentage of Carbohydrates.
Queen	43.14	13.55	20.39
Male	43.79	8.32	24.03
Worker	40.62	6.03	31.51

This shows that the food given to a qeen contains more fats and lesser carbohydrates than that given to the drones and workers.

As already mentioned a hive consists of Royal cells also and the eggs in these cells hatch into queen like bees only. Old hive from which eighty per cent of the bees have left with the queen remains without a queen. From one of the royal cells one queen-like bee develops atter a week of the departure of the old queen. In the other royal cells there are yet either the eggs, larvae or nymphs. This newly hatched queen-like bee realizes the fact that some days after all the

royal cells will produce queen-like bees and she will no longer be the unique ruler. Thus a sort of rivalry is produced in her mind. She considers them as her enemies, so she goes into royal cells one by one and destroys all the unhatched larvae and nymphs due to jealousy and after this action she becomes happy, because she has no enemy left behind. She is virgin and surprisingly she can lay eggs without being married by a process called parthenogenesis, but these eggs will develop only males and not the workers or the queens. The three types of eggs could only be laid when the virgin queen becomes married or fecundated. For marriage the queen takes an aerial flight. About ten thousand males even from surrounding tribes follow her path in gladness. The queen rises higher and higher to choose the only strongest lover for mating, perhaps in the ether. The feeble, the infirm, the aged renounce the pursuit and disappear in the void. At last the strongest or the fittest succeeds and within a second the queen and the male copulate together. According a Darwin there is a struggle for existence but here the struggle is for mating and love only, at the expense of life because just after the union the male dies as if struck by lightning. Thus a struggle for death is accomplished and only one, the fittest out of ten thousand, is fortunate enough to mate and die resulting into the "Death of the Fittest" against the well known phenomenon of the "Survival of the Fittest". What a sacrifice !

The queen after mating with the male, returns to the hive and the poor successful Drone has given her all that he possessed and much more than she required. The queen retains the seminal fluid containing millions of sperms which are retained in her body till the last day of her life. As the ovum passes through the body of the queen one sperm reaches the ovum and union of the two takes place resulting into a fertilised egg. This fertilised egg can produce all the three types of individuals, i.e., Males, Workers, and Queens. After the second day of the union she starts laying eggs and leaves the hive only when

she is to accompany the swarm as was done by the old queen.

A queen can live for successive years and during her life, on an average produces one and a half lac of eggs. The males do nothing except that they get food from workers. The workers feed the males till the day of mating. After the mating the workers turn against them and drive them out of the hive without the least defence. When they are out of hive, being unable to get honey from flowers they die off very soon.

At the approach of winter, the workers stop working and then along with the queen remain confined in the hive. Warmth is produced by the beating of wings. The spring comes again and the new queen is again ready to leave the hive with the swarm as the old queen had done. In this way the life cycle of a bee is completed.

It is worth mentioning that the life of a bee constitutes a very beautiful example of what the human mind can accomplish on a very high level of intelligence and it is difficult to assume that such perfection and flexibility in behaviour can be reached without some kind of mental process resulting into what may be called "thoughts" going on in the small heads of bees. I dare say that man has not achieved in his sphere what the bee has achieved in hers so far as this particular behaviour is concerned.

Mohammad Arshed M.Sc.

Education in the U. S. S. R.

In approaching the study of Modern Soviet education it is well to keep in mind the historical background of the Russian nation. Russia to-day is one of the great powers of the world, with an area of about $8\frac{1}{2}$ million square miles and a population estimated at over 193 million. It's area is twice the size of the U.S.A., but a huge amount of it is rendered ralatively unuseable by climatic conditions. Russia's natural resources include nearly all of those used by man, but the nation is especially strong in petroleum, lumber and water.

The governmental system constitutes the first large-scale experiment in state socialism and has involved the use of national plans known as the "Five Year" plans. Russia pursues a very agressive foreign policy based upon miltiary, economic, and propaganda pressures. This is a trend directly out of the past, since Czarist Russia was a great propagandist of force and imperial expansion. To many observers Russia has merely changed masters and is still engaged in state control of the individual, secret police surveillance of private life, and imperial expansion facilitated by all of the newer developments in technology and physiological warfare.

As background, the following dates and events will be helpful :-

988 - The region around Moscow is converted to Orthodox (Greek) Christianity.

1362 - The Czar (Caesar) assumes autocratic powers.

1613 - The Romanoff dynasty takes the throne and embarks on a programme of nationalism and imperialism.

Imperialistic wars of expansion are waged against the Muslims in the area around the Black Sea, and the Persians east of the Caspian Sea.

1726 - 1797 Catherine "The Great" acquires a large slice of Poland for Russia, also parts of the Ukraine. Wars against Astria. Russia Turkey and Persia.

1801 - 1825 Alexender I gains much territory for Russia as a result of Napoleon's defeat, but fails to get the Dardanelles, which would have given Russia access to the Mediterranean.

1854 - Crimean War. Russia was prevented from seizing Constantinople and the Dardanelles by France and Britain, who ally themselvas with Turkey.

1878 - Treaty of Berlin. Russia. after having defeated Turkey, is prevented from seizing territory on the European side of the Dardanelles. Russia then turns to "peaceful" penetration of Manchuria, Afghanistan and Persia.

1890 - 1900 British diplomacy deseats Russian aims in Persia and Afghanistan.

1905 - Japan decisively smashes Russian aims in the Orient.

1914 - Russia, to protect her "sphere of influence" in the Balkans, declares war on Austria, Germany simaltaneously attacks Russia and her ally, France. Turkey is on the side of Germany. Russia is promised that after the war Turkey will be dismembered and she will at last get the Dardaneles.

1917 - The Communist revolution breaks out. Russia's armies melt away. The new "Soviet" Russia renounces imperialistic expansion.

1918 - Germany, by the Treaty of Brest — Litovak, strips Russia of all the territories she had gained in Europe. Russia's Asiatic conquests, including the Muslim lands taken from Turkey and Persia, remain under Soviet control.

1920 - 1936 Russia concentrates on internal problems, repairing the damage of the Civil War, "collectivizing" the

peasants, building machine tools and power installations.

1936 - 1938. "The Great Purge". Almost a second revolution. Nearly every important Communist, and all the "Old Bolsheviks", are arrested and disappear from the scene. Almost every conceivable kind of plot is confessed et the "show trials", and the fantastic number of arrests is estimated as high as 10,000,000, most being released after a short time. Stalin emerges more firmly in the saddle than ever. The Russian people are taught to fear and distrust foreigners and the stage is set for a programme of nationalist-imperialist expansion.

1939 - Russia attacks Poland and Finland annexing territory.

1944 - Russia acquires the Baltic States.

1945 - Russia occupies Poland, East Germany, Bulgaria, Rumania, Hungary, Czechoslovakia and part of Austria. Gradually these states are taken over by Communism, aud brought behind the "Iron Curtain".

1946 - A Russain threat of force against Turkey is blocked by promises of aid to the Turks from the free world, Russain aggression in Berlin, Greece and Iran

1950 - is halted. Yugoslavia leaves the Russian orbit. Communist aggression in Korea is met with force.

1953 - Reports from behind the Iron Curtain indicate a new "purge" is taking place, mainly in the satellite countries (Czechoslovaki, Hungary, etc) but to some extent in Russia proper as well.

With these events, policies and dates in mind it will be considerable easier to understand the corresponding shifts in educational policy.

Organization.

In Russia both before and after the revolution of 1917 the educational system was largely decentralised. Under the Czars, to be sure, there was a *Ministry of Public Education* at the Centre, but some elementary schools were governed by the State, some by local communities, and some by private individuals. In post-revolutionary Russia there are of course

no Churches or private schools : all are controlled by political units, either local, state, or central. The essential differences lie in this : that the Czarist government insisted that all education be conducted in the Russian language but did not concern itseif with enforcing uniformity of content (i.e., subject-matter). The Soviet government allows a wide latitude in the language of instruction, but insists rigidly that no variations be allowed in a educational philosophy or method. By means of rigid control of all important offices through the only existing political party (the Communist party). Students in Central Asia learn the same things in the same way as do children in Moscow and Leningrad, even though many varied languages may serve as the means of communication. This is an important point in any discussion of local and regional autonomy. Language and cultural differences are actually encouraged but beside the Uzbek or Turkman who interprets this to mean separatism. The Soviet constitution states that any constituent Republic may withdraw from the Union at any time, but the absoul of the Communist party makes this impossible. Should any group openly advocate withdrawal they would be termed "deviates from the Party line", and shot or sent to a forced-labour camp.

Pre-School Education,

The basic principles of the Pre-School institutions have found their latest complete expression in the "Rules for Kindergarton" adopted in December 1944. These rules declare that, although the fundamental purpose of the Soviet Kindergarten is to achieve the all-around development of children between the ages of 3 and 7 years, such agencies should also be recognized as a means of providing mothers of young children with the opportunity to participate more actively in the complex "productive, govermental, cultural and sociopolitical life" of the nation.

In addition to these general functions, the rules state that Soviet Kindergartens must pursue a number of specific

aims, most important of which, from the Soviet point of view, is "the cultivation of love for the Soviet Motherland, its people and its leaders, its soviet Army, its wealth of natural resources, the creative genius of its people".

Under Soviet law, no preschool institution can be operated privately, although many of them charge fees ranging from small amounts so sums far beyond the reach of the average family income. Any public agency, such as a factory, a trade-union, or a collective farm - can establish a nursery school or kindergarten provided the school is placed under supervision of the proper educational body and conforms to all the regulations set up by that body.

Upon completion of the final year (usually age 7) the child should be able to..... count up to 20 or 30, recognize and compare figures, add and substract numbers of one digit, use simple units of measurement, name the days of the week, and tell time by the clock at least in terms of hours.

The child is then considered ready to enter elementary school.

The U.S.S.R. does not permit the growth of very large student bodies in any one higher institution. Possessing about half as many establishments (808 in 1949) as the United States. the Soviot Union has a total of much fewer than half as many students (734,000) in residence and 298,000 in correspondance courses in 1949).

In 1949, Soviet establishments of higher learning graduated 122,000 men and women. The degree granted upon completion of the four or five year undergraduate course is called the diploma, and is equivalent to the bachelor of science degree in the United States.

Character Education

In the early years of the Soviet regime the official attitude toward character education was rather annihilistic. The aim seemed to be to tear down the old concepts of morality, patriotism, and discipline and to allow the "1ree

growth'' of new humanistic virtues. In persunce of this aim. marriage codes were abolished, church attendance severly discouraged, militarism frowned upon, and manners and courtesy made the butt of rude jokes.

Today the expressed aims of Soviet education include new aspects of character and citizenship, as indicated by the "Rules for Kindergartons" previously described.

Moral and Religious Education

In many countries of the world, moral and religious education would be considered almost one and could be dealt with as such. In the Soviet Union however, they are not only divergent but definitely antagonistic. Since its inception, Bolshevism has been extremely hostile to religion, the Communist party carries on the struggle against any kind of religious beleif. Whereas "God's Law" was the required subject in the czarist school system, the Communists insist that "Darwinism" be taught as a separate subject and that all science study have an antireligious emphasis.

In view of the undeniably antireligious character of Soviet education, one might ask whether any moral educationcan exist. The Communists answer that it can, and point to many of the articles on this subject by Lenin, Stalin Knlinin, Molotov, Zhdanov, and other Soviet leaders. According to these authorities, "true morality consists in complete devotion to the Soviet system of society, unquestioned obedience to its leaders, willingness to make any personal sacrifice to advance its purposes, undying hatred for all its enemies, and the determination to devote all one's efforts toward extending this system through out the world".

All educational activity in the U.S.S.R. is directed toward instilling such principles as these into each citizen, regardless of age; these qualities can be considered as indicating the basic tenets of soviet character education. The difference is not merely one of against atheism, nor even of a religious morality in contrast to an ethic based upon

policital doctrines. Despite many official declaratiosn to the contrary, the soviet institutions are created and maintained largely to keep him in this capacity through benefits, persuasion, or force. Under this system, loyalty replaces devotion, morality bows before duty, and education - in the image of the society itself - becomes totaltarian in that it prescribes one thought for all.

The most flagrant example of political domination of education and research occurred in 1948 and concerned the physical rather than the social sciences. The hypotheses that acquired characteristics are inherited had been advanced by T.D. Lysenko as early as 1932, but the Communist party did not grant his ideas complete approval until August 1948. It was at this time that all Lysenko's opponents were ordered to choose between acceptance of this hypothesis and removal from scientific work. Despite the fact that Lysenko offered only the most biased evidence in support of his theories, whereas a large body of experimental findings existed to prove the contrary, his views coincided with the dogma demanded by the political leaders and therefore his doctrines became the new law of soviet genetics.

Elementary Edncation

The system of general education in the U.S.S.R. comprises three main types of schools (1) the elementary school of four grades; (2) the "incomplete secondary" school, which provides the four grades of the elementary school and an additional three grades; and (3) the "complete secondary" school, which provides the seven grades of the "incomplete secondary" school and an additional three grades. Soviet schools open on September I and close May 20 except for pupils in the graduating grades (the fourth, seventh and tenth) in each type of school, who must take final examinations uptil June 5. Holidays are few: three days in early November, ten days in late December and early January and six days in March. The number of elementary class hours per week ranges from

twenty four in the first grade to twenty seven in the fourth grade.

All elementary grades in the Soviet Union are coeducational and free of any tution charge.

Since compulsory seven-year education is now in effect in all cities of the U.S.S.R. these localities usually supplement the lower four grades with an additional three years to form the incomplete secondary school. The independent elementary school is therefore confined largely to the rural areas.

Secondary Education

The incomplete Secondary School

As explained in the preceding section, the Soviet secondary schools are of two types, designated as "incomplete" or "complete". The incomplete secondary school has a seven-year course, the first four years of which correspond to the curriculum of the elementary school. Therefore, the child who has passed the final examination of the fourth grade in either an elementary or incomplete secondary school may enter without entrace examinations the fifth grade of the latter institution.

The complete Secondary School

The complete secondary school is actually a ten-grade establishment combining the four elementary grades, the three intermediate grades, and the three final grades.

Throughout the Soviet Union boys and girls attend classes in grade eight, nine and ten. However, the curriculum is the same for both sexes except in particular in the three-year course in physical training. The boys take military while the girls divide their time between physical training and domestic science. Pupils usually are graduated from the complete secondary school at the age of seventeen or eighteen and are then qualified for admission to any of the various types of institutions of higher learning through competitive examinations. Graduates with marks of "excellent" in all subjects

in the final examinations receive a diploma *cum laude* which entitles them to admission to higher institutions without competitive examinations. Since applications to such institutions are usually more than double the number of vacancies, and since all *cum laude* applicants are accepted before the competitive examinations are held, relatively few vacancies in the more popular higher institutions remain open to competitive examination.

Institution of Higher Learning

There are three basic types of higher educational institutions in the U.S.S.R.—universities, institutes and colleges. Unlike the schools in the three-level system of general education previously described most higher institutions are governed by an all-union administrative apparatus : rather than by the educational ministries of each republic.

Although the powers of this Ministry are broad, its jurisdiction extends to fewer than half of Soviet higher institutions. All thirty-one universities are included in its authority, along with about 281 institutes devoted to such fields as technology, agriculture, forestry, veterninary sciences, economic and law. The remaining five hundred higher institutions such, as institutes of transport, medicine, art, physical culture, and pedagogy are assigned to the ministry most concerned with the field of study. Pedagogical institutes, numbering 325, are governed by the ministries of education in each republic, since there is no all-Union ministry for this field.

Higher education in the Soviet Union is extremely specialized character and completely professional in purpose except in the thirty one universities which provide training for teaching and research in such broad subjects as mathematics, language the social and physical sciences and occasionally, law; and, the nineteen polytechnics and industrial colleges which offer a rather general education along with technical lines. All establishments of higher learning are called "institutes" and are devoted to specific fileds such as medicine.

Thus, as one field of learning after another is invaded

by the tide of political orthodoxy, research is used as an instrument of oppression rather than a ladder to freedom. The question here is not which group of scientists is considered right and which wrong, but the previlege of both groups is to carry on research and express opinions.

Party Schools

In addition to the regular system of schools open to the people there is a second system at the youth and adult level designed to provide the special kind of preparation necessary for Party members and particularly for Party leaders. Since its central function is the training of the Communist priesthood, it may be likened to the theological schools which have been maintained by religious sects and theocratic states from time immemorial. Moreover, wherever the Party may be found in strength in other countries, it endeavors to establish schools after the Russian model.

The Soviet system in its postwar structure, according to Malenkov, is organized on three levels. At the first level, as of September, 1947, there were 177 "two-year schools and nine-month courses" enrolling "about 30,000 Party, Soviet, Komsomol, and newspaper workers." These institutions prepare for the lower posts in Party and state. At the second level is a three-year Higher Party School which prepares a smaller number for position in the upper ranges of the Party and state apparatus. In 1947 approximately one thousand students were enrolled at the third and highest level is the Academy of Social Sciences. This institution is "called upon to prepare theoretical workers for central Party institutions, central Committees of the Communist Parties of Union Republics, regional and provincial committees of the Party, and also qualified teachers for higher technical schools and universities and theoretical workers for scientific research institutions and scientific journals".

The attention given to this system of Party schools and the founding of Social Sciences demonstrate the utter seriousness of the postwar domestic and foreign policy on which this action of the Partys rests.

M. Azeem Khan B. Sc.

Parasitism in Animals

What is Parasitism? What is a Parasite? What is the origin of Parasitism? What are its types? are the questions which a scrupulous student of Biology will ask himself. And he will probably ask himself two more; What are its adaptations and effects on other living beings? What importance can be given to it in the life?

WHAT IS "PARASITISM"?

A parasite may be defined, with some approach to accuracy, as an animal which, for an appreciable time, lives in or on the body of another, considerably larger animal, called the host, to the detriment of the latter, but without causing its until reproduction of the parasite has occured. Often it is seen that people confuse the parasites with carnivores who take flesh as their food. But these are totally different conditions, the parasites remain for a sufficiently long time within their hosts and usually do not kill them. On the other hand carnivores kill their prey very soon, and digest it immediately. There is only one exception i.e. Gerbes, which preys upon the eyes of large fish, and the fish passes the rest of its life blindly.

TYPES OF PARASITISM

Parasitism is not only found in animals but in the plants as well. The animal parasites are called zoo-parasites and the phenomenon is known as the zoo-parasitism, whereas the parasitism

found in plants is termed as phyto-parasitism and the parasites phyto-parasites.

Parasites may be ecto-parasites or endo-parasites and the phenomenae are known as ecto-parasitism which confine themselves to the surface or outside of the body, and cause irritation. The endo-parasites are found inside the body or in the cavities of the host. Physiologically speaking the following types are common :

(i) *Obligatory parasitism.* It is an association where one animal, the parasite is compelled to remain during the whole of its life in or on the body of another animal, i.e. the host. e.g. sucking and biting lices.

(ii) *Facultative parasitism.* It is such an association where one animal i.e. the parasite, can exist as a free living being as well as a parasite. e.g. Tse-tse fly.

(iii) *Intermittent Parasitism.* It is an association where the host is preyed upon at times and the parasite is a free living creature. e.g. leeches.

(iv) *Transitory Parasitism.* It is the association of parasites with their hosts during a part of their life. e.g. Bot Flies.

(v) *Multi-Parasitism.* It is the parasitisation of some host by two or more species of parasites at the same time. For instance Cerattus capata (an insect) is parasitised by Ophious huminis and Diachasma simultaneously.

(vi) *Super parasitism.* It is the association of more than one parasitic larvae of the same species to the same host. Such parasites are called the "super parasites" and the phenomenon as the "super parasitism".

(vii) *Hyper Parasitism* It is the parasitisation of one parasite by another parasite.

Adaptation and Effects of Parasitism on the Parasites.

Parasites are adapted to the various modes of life "physiologically" or "Morphologically". In physiological mode of life, they require a host to get food and shelter etc.

In morphological mode of life their structure is modified

to suit the parasites. As soon as the modes of life progress these structures become more perfective and exclusive. A few examples of the parasitic modes of adaptation may be described here although the features of the parasites are very unusually developed and a few parasitic representatives of higher groups like Crustacea, Insecta, have lost their characteristic features.

(1) *Structure of the Mouth Parts.* Ecto-parasites have got piercing and sucking mouth parts. But Mallophage and Bird-Lice feed on feathers with the help of their biting mouth parts.

(2) *Organs of attachments.* They may be present in the form of suckers and hooks. As for instance, and anterior and posterior suckers of leeches and well developed claws of Lice. Gut-living "Endoparasites" also have organs of attachment like hooks and suckers e.g. in tape worm hoocks, sucking Mouthparts of Hookworm.

(3) *The organs of digestion.* The digestive system is very simple because most of them get already digested food. But some get Amino-acids, and Hexoses, instead of polysaccharides in the small intestine. Therefore they need some digestive enzyme for the synthesis or oxidation. So the parasitic mode of life allows an innate tendency to go to an extreme. For example, in Cestodes gut is absent. Similarly in Platyhelmenthes the gut is degenerated but in some turbellarians the gut is replaced by a solid mass of cells.

(4) The organs of locomotion and sense may be absent or poorly developed. For instance, the Guinea worm gets its head to the right place at right, showing a co-ordinate response of the parasites. Dircetion toward the Parasite.

The reproductive organs are very much developed. It is to ensure enormous production of offspring. They eat too much to lay a large number of eggs.

(6) The parasites can live only in an atmosphere of oxygen. Those which live in arterial blood have an excess of oxygen, where-as those which live in venous blood and in tissues respire anacrobically like the muscles of vertebrates. For ex-

ample, Trichinella produces Carbon dioxide anaerobically in the absence of any organic acid because the adult has no glycogen.

Many a vertebrate has protozoan parasites in their rectum. So those parasites get very small quantity of Oxygen and sometimes they have to respire anaerobically.

(7) Hermaphroditism is not so common in parasites as compared to the whole of the animal kingdom. As for instance liver fluke, Tape-worm are hermapprodite but they have well developed copulatory organs and it shows that cross-fertilization is still in practice.

Effects of parasitism on Hosts. It is observed that the really successful parasites do not kill their hosts, even they don't harm them so much. If some host is killed, it happens after certain limit to the power of the parasites. For example Ichneumon fly consumes its host, and trichinella kills its host after a considerable period.

Generally the deaths of the hosts keep pace with their reproduction. Infection can only be spread if the hosts are thickly populated and if their population is less dense then they would not be easily infected. So in this way host-parasite ratio is kept self regulated. The rise and fall in the number of many animals goes on taking place. For example when voles become over populated to a certain degree, then a parasite causes some epidemic and in this way their number is kept constant.

The nature of the parasites and environment also have a pronouced influence on the hosts. For instance, ectoparasites cause irritation.

The endoparasites live in the gut e. g. T. Worm, Ascaris and only take up a part of food. But if they become overpopulated their food supply is retarted and host suffers from vomiting and diarrhoea. Hookworm causes Anaemia.

Some parasites which live in the fluid tissue (blood and Lymph) take up some food only and have no pathological effects as Filaria simply blocks the vessels. Some parasitic species of the protozoa, Tremetoda and Insecta attack gonads

and cause parasitic castration. For instance in cirripede castration takes place with the changes in the secondary sexual character.

Host Variation :

When the parasite completes its life history in two hosts then the host in which the parasite becomes sexually mature is called as "primary Host" or "definitive Host", while the other host in which the rest of life is passed is known as "Secondary Host". When there is no sexual phase the man is termed a "Primary Host" as in Trypansomas.

Immunity of the Host and Parasite.

The word immunity when it is used for the host, means the power or capacity of the host to resist disease or to free itself from disease or not able to be attacked by the parasite due to its efforts to make firm in itself. It is done in two phases.

(i) The development of the parasite is checked due to unsuitable environmental conditions or other prohibition imposed by the host. For instance it is observed that cyst cases and egg shells are always obsorbed and dissolved to set free the embryo as in Tape Worm. Secondly the host may fight against the attacking or ruling parasites. It has two sub-phases.

(i) Cellular mechanism. In it the parasites are devoured and destroyed by the phagocytes which are present in the blood.

(ii) Chemical mechanism. The presence of parasite causes the production of such substances which have a specific action on the things which bring them into being e.g. :

(a) Antibodies which neutralise only the objectionable effect of antigens produced by a parasite. Just parallel to it there is another phenomenon of Biological control. There are some insects which are though parasitic on other insects but they are very useful in holding agricultural pests. Such insects are often reared artificially to be liberated at the proper time for the purpose of control. This phenomenon is called as Biological control.

Importance : Parasitism has got a great economic importance because due to its effects so many diseases in animals, plants and human-beings are caused. For example, Entomoeba histolytica causes dysentry, plasmodium Malaria ; Trypanosoma, sleeping sickness ; Trichina spiralis causes trichiniasis etc. Only a few parasites which are harmful to men are parasitized by other parasites, saving the man from that harmful effect but such cases are very few. Now it is up to your research that you find some means to avoid parasitism.

Naeem Ahmad

Nuclear Reactors

Nature has provided everything for human beings in this universe. Whenever man worries about the shortage of anything supporting life, a better substitute is always provided to him. When he felt the need of fire, wood, in the form of jungle, was provided. A time came when the shortage of wood disturbed him. Then a still better substitute in the form of coal was given to him. Similarly atomic energy has now come as a substitute for the conventional fuels such as coal and petrol. In the same way a time might come when people shall find out a still better substitute for Atomic Energy.

Elements which possess the peculiar property of emitting constant radiations are the real source of atomic energy. Such elements are called radio active elements. The radiations emitted by them are of three types viz : *alpha* rays, *beta* rays and *gama* rays. When *alpha* rays are bombarded on elements like berylium, boron and helium they produce a new type of particles known as neutrons. When elements like Uranium are bombarded by neutrons they split into two fragments with the emission of more neutrons. Some of these newly produced neutrons explore more uranium and the remaining ones are converted into energy. This process of breaking up of elements into fragments with the emission of more neutrons is known as *nnclear fissihn.* A device which 'burns' fissionable materials for useful purposes is known as NUCLEAR REACTOR.

There are two ways of producing atomic energy from Uranium. One is to strike the nuclei of Uranium-235 atoms

with neutrons and the other is by converting non fissionable Uraninm-238 to plutonium (PU239) and then bombarding it by neutrons To bring about the fission of Uranium-235 the neutrons used as bullets must be going at just the right speed, neither too slow, nor too fast. The slow-moving neutrons will not be able to enter the nucleous of uranium atom while the fast moving neutrons will pass through it without producing fission. The example of a glass plate is very similar to this. The plate will not break if struck slowly. If a bullet is fired it will pass through it leaving behind a small hole. The glass plate will not break into pieces in either case. Moreover the mass of uranium counts very much in this change. Only a suitable quantity will undergo fission, otherwise the chain reaction will not start.

To blow down the speed of neutrons, elements of low atomic numbers are used. Carbon in the form of graphite and heavy water are mostly used for this purpose. The elements which blow down the speed of neutrons are called moderators. During fission, the reaction is so vigorous that it goes out of control. In such a case it does the work of an atomic bomb. It may destroy every thing completely. To prevent this misshap cadmium rods are used which absorb the neutrons and ultimately the reaction stops.

The first successful reactor was built under the grand stands of Staggfield, a part of the university of Chicago. It was a pile of graphite, uranium, lead and concrete weighing more than 1400 tons. Graphite bricks, about two inches square and 16 inches long, were laid. In between two graphite bricks there was a layer of bricks having holes which were filled with uranium or uranium oxide. When the 50th layer was laid down that contained 52 tons uranium, a critical size was reached and the reaction started. At the top of the reactor heavy rods of cadmium were fixed and a man with an axe was on duty to cut the ropes at the slightest danger.

Many of the reactors in the world are graphite moderator reactors. Only a slight modidcation is made in some of the

reactors, the results of which are hopeful. Heavy water (D20) has been used instead of graphite and it is certainly more efficient than carbon.

The heavy water ractor itself is an aluminium tank, 6 feet in diameter and 6 feet high and contains about 6 tons of heavy water. In the tank 120 uranium rods, each about one inch in diameter and 6 feet long, are placed. Cadmium safety rods are placed inside the tank. This reactor is small is size, fuses only three tons of uranium - 235 and operates comparatively well. As heavy water circulates insid it changes the heat energy with outside air. In this ractor if cadmium rods fail to stop the reaction, heavy water can be removed from it at once.

Another iorm of reactor is the water boiler. The heart of it is a stainless steel sphere, one foot in diameter which contains a mixture of uranium-235 and uranium-238 in the ratio one to six. In this reactor the fuel required is less than two pounds. In the sphere, tubes containing irradiated material are placed, also a metal spiral is put in it through which water circulates and gives its heat to the exchanger.

This reactor operates normally at a pressure of six hundred pounds per square inch. Half of the thermal energy leaves the reactor as steam which is applied to turbines, while the other half leaves the reactor in the form of hot water which is removed from the bottom of the reactor. This is under a pressure of 350 pounds per square inch. When the pressure is lowered this water vapourises into steam which is sent to the turbines.

In the graphite and heavy water reactors much energy is wasted during the slowing down of the neutrons due to their absorption. There is another type of reactor in which very small amount of fissionable uranium is used. Also non-fissionable materials are placed near it and are converted into fissionable ones, This type of reactor is known as BREEDER REACTOR. The term "breeding" means the prodution of more fuel to replace the fuel used up in the fission reaction.

In other words more fuel is produced than is consumed during this process.

So, it is the cheapest reactor ever built. In this reactor light metals like sodium and potassium are used as heat exchanger. Inside the heat exchahger a coil of metal passes through which water flows. This water changes into steam. The steam then turns the turbines of the electric generator. This reactor is very useful because it produces a stream of neutrons which are utilized in many ways to learn more about nuclear physics.

Developing countries are badly in need of such a source which can provide cheap electricity for their industries as well as for other projects. Our country also needs such reactors because we are short of coal and petrol. Without sufficient power our industries cannot flourish. At present we are wasting much of our wealth in importing conventional fuels from other countries.

Naeem Osman Noori

UHURU

Uhuru is a Swahili word. It stands for freedom or independence. This article mainly deals with the long struggle for independence in my country but before proceeding further it would be necessary to brief the readers on the historical and general background of Kenya.

The Arabs were among the first people from Asia to visit the coasts of Kenya but they did not pay much heed to discover the interior parts and instead used the ports of Kenya as trading posts. The first Europeans ever known to set foot on the coast of Kenya were the Portugese when Vascoda-game anchored his ship near Malindi on his way to India in the later half of the 17th Century. His visit laid the foundation of European Empire in East Africa. Later the British, the Germans and other Europeans started taking interest in exploring the continent. David Livingstone Stantley, Speke and Burton were among the Europeans who risked their lives in exploring the Dark continent and in laying the foundation of the imperialist rule in East Africa.

Kenya is surrounded by the Indian Ocean on the East, Somalia and Sudan on the North, Uganda on the West and Tanganyika on the South. It shares Africa's largest Lake, Victoria, with its neighbours, Uganda and Tanganyika, and the largest Peak in Africa, Mount Kiliminjar with Tanganyika. The second largest snow capped peak of Mount Kenya stands aloft in the heart of Kenya. The rift valley passes through the west of Kenya, leaving behind many volcanic mountains and small rift valley lakes.

Kenya enjoys the benefits of the greatest wild life in the world. It has five big national parks namely the Tsauo, the Ngong, the Nairobi, the Amboseli and the Marsabit. Besides these, it has countless wild life reserves. The wild game can be seen in these parks roaming about and loitering in their natural surroundings.

Its population, of about seven and a half million, is shared by Africans, Arabs and Europeans. The Asian community is divided into the business class and the civil servants. The Europeans are either designated officers or own large business concerns and the Africans are mainly employees. The main native tribes of Kenya are the *kikuyu*, the *Luo*, the *Kipsigis*, the *Nandi*, *Turkana*, the *Borana*, the *Taita*, the *Makamba* and the *Masai*. Besides these, there are many other minor tribes.

National resources are very poor but Kenya depends mostly on agriculture. Coffee, sisalhemp and tea are its main products with pyrethrum and wheat as subsidiary products. Farming is mechanized and very little man-power is used. Industry has started developing in Kenya. It has very large sugar and tea factories.

The means of communication are the most excellent and modern. Railways can be found linking all the important towns and agricultural areas. Roads act as feeders to the railways.

The largest and the most important city which is also the capital of Kenya, is Nairobi. It lies 300 miles inland from the coast. Mombasa is the main port and a gateway to Kenya and Uganda. Other important towns are Kisumu, a port on Lake Victoria, Nakuru Eldoret, Kitale, Nanyuki and Nyeri.

Nairobi itself has three airports. One of them is an international one for flights running from north towards the south. Kenya has also a national flight service shared along with its neighbours, namely, Uganda and Tanganyika. I hope this is enough to give you a general idea of the

to this, the *KAPA* had to give up their struggle against European domination but not for long, as in 1928, the party became active again under the leadership of Mr. Jomo Kenyatta, a faithful humble and intelligent leader who pulled his socks and started the campaign again. He started a party newspaper and fought head and soul against the brutal policy of the Europeans. The Africans encouraged that local journal as it gave them the correct news of what was being done by the whites in order to suppress the blacks. Kenyatta was sent to the United Kingdom to present the case of the Africans to the Colonial Secretary but his mission was fruitless. He came back home disappointed but not discouraged and took up his work again as leader of the party aiming to destroy imperialism. But unfortunately, in 1930 the Government banned the party on the basis that it was a danger to the Colonial authority in Kenya.

The following year Kenyatta again visited the United Kingdom but his efforts were all in vain. He stayed there till 1946 and this brief period helped him much to understand these people. Due to his absence, Kenya sufferndd a lot. He returned home again in 1946 and did not fail to renew his efforts for the liberation of Africans.

He accepted the presidency of the then existing party, the Kenya African Union. Under his guidance the colony started its march again but the Government was reluctant to give any rights to the Africans. As a result, terrorism prevailed in Kenya and a state of emergency was declared by the governor of Kenya, Sir Evelin Baring. The angry crowds started killing, destroying, and burning people and property. Nobody was safe in these panic-strickn days. Every one lived in a state of fear, grief and misery. This left a mark in the history of Kenya. Thousands were killed, thousands lived in misery for the short period of emergency. Kenyatta, along with the other leaders of Kenya namely General China and Dedian Kimathi, were arrested and accused of being the leaders of the *Mau-Mau*, the rebellious group. Kenyatta was

sent to prison and Kimathi to U.K. for trial and was latter hanged on the ground that he had tried to arouse the Africans against the Government. New prisons were built and the tribes of Kikuyu, Meru and Embu were pushed into them. Little food was provided to them and in return they had to work very hard for the imperialists.

Thousands of people were killed in the riot; property worth millions of pounds destryoed, countless people died in the prisons due to inhuman treatment of the imperialists, and thousands of innocent people were rendered disabled for the rest of their lives. This tragedy was as worse as that of the Black Hole of Culcutta. All this happened because of the inhumanity and injustice of the imperialists in Kenya.

Kenyatta was taken away from his people and sentenced for 7 years and was later on put under detention. People were not allowed to meet him, but not for long as the struggle for his release started.

The Kenya African National Union (KANU) and the Kenya African Democratic Union (KADU), though having different policies, tied their hands to free the father of the nation. They had achieved more than half of the aims of Kenyatta but still they needed the guidance of the man who had devoted his life for their sake. They had obtained seats in the *Legco* and had broken many barriers which impeded the Independence movement. Both parties were always on the opposite benches but the thought of Kenyatta brought them together for once. Despite opposition from the Government benches and the settlers, the parties achieved their goal and on 14th August 1961, Kenyatta was declared a free man at his house in Maralal where he was under detention. The people's hearts were filled with joy on the news of the release of the founder of the liberation movement and the father of the nation.

He was again at the disposal of the peace-loving people, free to resume his duties and to put a final touch to the job

he had started years ago. Though the KANU and KADU had achieved and paved much of the way towards independence still the services of Kenyatta were essential.

Kenyatta resumed his duties as the leader and President of the Kenya African National Union, the majority party of the Kenya. The post of the president of KANU was vacated by the then President of KANU the Honourable Mr. James Gichuru and the seat in the Legco by a well-wisher of Kenyatta, a member of KANU and an elected member from the Forthall Area.

Th parties went to United Kingdom for the Lancaster House Conference in 1962. KANU led by Kenyatta and KADU by its leader Mr. Ronold Nagala. The talks were successful to some extent as there were still some differences between the two major parties on the form of government Kenya should adopt after Independence. KANU on one hand claimed a strong central government whereas KADU supported federal system of government with the rights of autonomy for Regions in order to protect the rights of the minority tribes of Kenya.

KADU's proposal was accepted for the time being and it was decided that a general election would take place in Kenya in 1963 which would give the majority party the right to form government. KANU gained an overwhelming majority over its rival parties and in the middle of 1963, Mr. Kenyatta was called upon by the Governor of Kenya to form a government. Mr. Kenyatta was sworn in as the first Prime Minister of Kenya, and other regional presidents were also sworn in. Mr. Nagala was sworn in as the President of the Coastal region, a stronghold of KADU.

Later on Mr. Kenyatta went to London for the final talks with the British Government. He achieved the aim of his party having a central National Govt. and crushsd down the previously decided form of federal government. Moreover he demanded a fixed date for independence for which thousands had suffered and

millions were waiting for. Kenyatta returned victoriously and there were over a million people waiting to greet him back home from a successful mission.

Kenya was going to be independent with a courageous man as its prime-Minister and the worthy Ngala as the leader of the opposition.

On 12th December 1963 Kenya was proclaimed an independent country. The people achieved what they had waited and suffered for. The happiest day in the history of Kenya had come ; the Union Jack was slowly and Solemnly brought down and the Kenya's new National Flag was hoisted up. A new country was born and UHURU KENYA was proclaimed with the motto of security, freedom and justice for all, no matter what caste, creed or colour Slogans of *harambee* could be seen everywhere. *Harambee* towards the prosperity of KENYA.